ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۷	اپریل ۱۹۷۲ء مطابق صفر ۱۳۹۲ھ	عدد ۲

ماہنامہ ترجمان القرآن

۵ - اے ذیلدار پارک - اچھرہ - لاہور

چندہ سالانہ : آٹھ روپے - فی پرچہ ۸۰ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن ، اچھرہ - لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

جس طرح عارضۂ جسمانی کے اثرات کو زائل کرنے اور مریض کے اندر تندرستی اور توانائی کے احساسات پیدا کرنے کے لیے چند تدابیر کا اختیار کرنا اشد ضروری ہوتا ہے بالکل اسی طرح کسی شکست خوردہ قوم کے احساسِ شکست کو مٹانے اور اس کے اندر از سرِ نو خود اعتمادی اور حوصلہ مندی پیدا کرنے کے لیے بعض تدابیر سے کام لینا بالکل ناگزیر ہے۔ پرانے وقتوں میں تو مختلف اقوام کے سربراہ اور اربابِ بست وکشاد اپنے اپنے حالات کے مطابق مختلف تدابیر اختیار کر کے یاس و قنوطیت کا تدارک کر لیا کرتے تھے مگر اس موضوع پر کوئی باقاعدہ لٹریچر موجود نہ تھا لیکن دورِ حاضر میں جنگ کے حوصلہ شکن نفسیاتی اثرات کو دور کرنے کے لیے بڑے بڑے وسیع پیمانے پر تحقیق کی گئی ہے اور اس موضوع پر بعض نہایت قابلِ قدر کتب بھی شائع ہوئی ہیں۔ اس موضوع کو دورِ حاضر میں اس لیے بھی غیر معمولی اہمیت حاصل ہے کہ دنیا کی ہر جارح قوم کمزور قوموں کی آزادی سلب کرنے کے لیے ایک طرف ناقابلِ بیان حد تک تباہ کن آلاتِ حرب استعمال کرتی ہے تو دوسری طرف بڑی چابکدستی اور ہنر مندی سے ایسے نفسیاتی ہتھکنڈے بھی کام میں لاتی ہے جن سے پہلے تو قوم کے اندر دہشت پھیلتی ہے پھر میدانِ جنگ میں اُسے شکست فاش ہوتی ہے اور اس کے حوصلے اس قدر پست اور عزائم اس حد تک مضمحل ہو جاتے ہیں کہ وہ دوبارہ مقابلے میں آ کر اپنے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کرنے اور اپنے نقصانات کی تلافی کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ اس کے میدان میں قدم اس انداز سے اکھڑتے ہیں کہ پھر کبھی جمنے نہیں پاتے اور جوں جوں وقت گزرتا ہے اس میں احساسِ زیاں پیدا ہونے کے بجائے یہ احساس مردہ ہوتا چلا جاتا ہے اور جلد ہی ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ اس زیاں کو اپنی فلاح و کامرانی خیال کرنے لگتی ہے اور ذلت و خواری کو اپنا مقدر سمجھتے ہوئے اس پر راضی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ دنیا کی ہر باوقار قوم جو اس کرۂ ارض پر عزت و احترام کے ساتھ رہنے کا عزم رکھتی ہے وہ جہاں

دشمن کی جنگی چالوں پر کڑی نگاہ رکھتی ہے اور انہیں ناکام بنانے کی کوشش کرتی ہے وہاں نفسیاتی حربوں سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر کرتی ہے کیونکہ اگر کوئی قوم ذہنی اور جذباتی اعتبار سے مفلوج ہو جائے اور اس کے عزائم پست ہو جائیں تو پھر اس دنیا میں اس کا وجود بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی حیثیت اس نمک کی سی ہو جاتی ہے جس کی نمکینی بالکل زائل ہو چکی ہو۔ اور اسے بیکار سی چیز سمجھ کر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں ڈال دیا جائے۔ ان صفحات میں ہم دشمن کی چند نفسیاتی چالوں کی تفصیل درج کرتے ہیں۔

دشمن کسی قوم کے احساسات اور جذبات کو مُردہ کرنے کے لیے سب سے زیادہ اس بات کا اہتمام کرتا ہے کہ مغلوب قوم کی زندگی جس نظریے سے عبارت ہے اور جس کے زندہ رہنے سے اس کے اندر کسی وقت بھی نئی رُوح بیدار ہو سکتی ہے اُسے ہر قیمت پر فنا کر دیا جائے اور اس کی جگہ اس کے اندر وہ نظریات داخل کیے جائیں جو اس کے ذہن میں انتشار اور عمل میں اضمحلال پیدا کریں۔ اس سلسلے میں تین نوعیتوں کے جائزوں پر نفسیاتی جنگ کا نقشہ تیار کیا جاتا ہے۔ اگر کسی قوم کی آئیڈیالوجی ناقص ہو اور اس کے بارے میں غالب قوم کو اس امر کا یقین ہو کہ یہ آئیڈیالوجی خود ہی اس قوم کو تباہ کر دیگی تو جارح قوم مغلوب قوم کی آئیڈیالوجی سے تعرض نہیں کرتی۔ نفسیاتی حربے زندگی کے بعض دوسرے شعبوں میں آزمائے جاتے ہیں۔ لیکن اگر فاتح قوم یہ محسوس کرے کہ مفتوح قوم کی آئیڈیالوجی اس میں زندگی کی حرارت اور ولولہ پیدا کر سکتی ہے اور اُس قوم کو اپنی آئیڈیالوجی پر اعتماد بھی ہے تو پھر اُسے خاصی تشویش لاحق ہوتی ہے اور وہ اس امر کی کوشش کرتی ہے کہ اس آئیڈیالوجی سے اس قوم کا جو گہرا تعلق ہے اسے ختم کر دیا جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو آئیڈیالوجی میں اس نوعیت کا ردوبدل کر دیا جائے کہ وہ قوم کے تنِ مُردہ میں زندگی نہ پیدا کر سکے۔

غالب قوموں کے ان نفسیاتی ہتھکنڈوں کے مقابلے کے لیے زندہ قومیں ہمیشہ تیار رہتی ہیں۔ چنانچہ حالات کے دباؤ کے تحت اگر انہیں وقتی طور پر میدانِ جنگ میں اپنی شکست بھی تسلیم کرنی پڑے تو اسے تسلیم کر لیتی ہیں مگر اپنی آئیڈیالوجی کا پوری قوت سے تحفظ کرتی ہیں اور اس محاذ پر کسی طرح بھی پسپا

ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتیں۔ کیونکہ انہیں اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ اگر دشمن ایک وقت میں ان کے ملک کا کوئی ٹکڑا سلب کر لینے میں کامیاب ہو گیا تو اسے پھر واپس لیا جا سکتا ہے لیکن اگر فاتح قوم کی آئیڈیالوجی مفتوح قوم کی آئیڈیالوجی کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئی اور غالب آئیڈیالوجی نے مغلوب قوم کے دل کے کسی گوشے پر قبضہ کر لیا تو اس گوشے کو کبھی واپس نہ لیا جا سکے گا۔ سلطنتوں کے حدود میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے مگر دل کی دنیا جس نظریے اور نصب العین سے آباد ہوتی ہے وہ اگر ایک مرتبہ اجڑ جائے تو پھر مشکل ہی سے اس پر بہار آ سکتی ہے۔ چنانچہ دنیا کی زیرک قومیں ہمیشہ اس نظریاتی شکست سے بچنے کی فکر کرتی ہیں انہیں جس نسبت سے میدانِ جنگ میں ہزیمت اٹھانا پڑتی ہے اسی تناسب سے وہ آئیڈیالوجی کو سینے سے لگاتے رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ آپ دوسری جنگِ عظیم کو ہی لیں جنگ کے آغاز میں جہاں تک میدانِ کارزار کا تعلق ہے، ہٹلر کا پلڑا بھاری رہا اور برطانیہ اور فرانس کو متعدد محاذوں پر شکست کا سامنا کرنا پڑا مگر اس سارے عرصے میں برطانیہ اور فرانس کے نشر و اشاعت کے وسیع ذرائع جمہوریت پر اپنے غیر متزلزل یقین کا اعادہ کرتے رہے اور پوری دنیا کو یہ باور کراتے رہے کہ وہ یہ جنگ آئیڈیالوجی کے حفظ و بقا کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اس پراپیگنڈے کا ایک مقصد تو محوریوں کے موقف کو کمزور ثابت کرنا تھا مگر دوسرا اہم مقصد یہ تھا کہ انگریز اور فرانسیسی عوام کے ذہنوں سے یہ حقیقت محو نہ ہونے پائے کہ وہ ایک مخصوص نظریۂ حیات کے علمبردار کی حیثیت سے محوریوں کے خلاف صف آرا ہیں اس لیے اس نظریے کے ساتھ ان کی وابستگی میں کبھی کمی نہ آ جانی چاہیے کیونکہ اس کمی سے نہ صرف ان کے عزائم مضمحل ہو جاتے بلکہ ان کی قوتِ کار اور ان کا جذبۂ ایثار بھی کم ہو گا۔ کسی نصب العین سے محبت ہی کسی قوم کے اندر عمل کی غیر معمولی قوت، صبر و تحمل، ایثار اور تدبر پیدا کرتی ہے اور اس کے ساتھ گہری وابستگی ہی سے اس کی صفوں میں اتحاد پیدا ہوتا ہے جس قوم کا اپنا کوئی الگ نظریہ نہ ہو اس کا الگ وجود بالکل بے معنی ہوتا ہے اور جسے اس نظریے سے عشق نہ ہو اور اس کے دل میں اسے دنیا میں سربلند کرنے کا عزم نہ ہو وہ قوم، قوم نہیں ہوتی بلکہ راکھ کا ڈھیر ہوتی ہے جسے طوفان تو ایک طرف رہا ہوا کے معمولی جھونکے بڑی آسانی کے ساتھ بکھیر دیتے ہیں۔

فاتح قوم مفتوح قوم کی عارضی اور وقتی شکست کو مستقل شکست میں تبدیل کرنے کے لیے دوسرا

نفسیاتی حربہ یہ استعمال کرتی ہے کہ مفتوح قوم کے ذہن میں اس طرح خلفشار پیدا کرتی ہے کہ شکست خوردہ قوم اپنی شکست کے اسباب کا صحیح طور پر ادراک نہیں کر سکتی اور مختلف نوعیتوں کے منطقی مغالطوں میں گرفتار ہو کر ایسا طرزِ عمل اختیار کر لیتی ہے کہ جس سے اُسے مزید تباہی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ کبھی سنبھلنے نہیں پاتی۔ اس کا ہر قدم انحطاط کی طرف اٹھتا ہے۔ گذشتہ چند سالوں میں اسرائیل نے عربوں کی قوت کو مستقل طور پر برباد کرنے کے لیے جنگ کے بعد جو نفسیاتی چالیں چلی ہیں اُن سے اُن کی نوعیت کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ عربوں کے اندر عرب قوم پرستی کے بڑھتے ہوئے جذبات نے انہیں دوسری مسلمان قوموں سے الگ کر دیا اور خود اُن کے اندر انتشار کو جنم دیا۔ عربوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ عرب قومیت کی تشکیل میں زبان ہی اساس کا کام دے سکتی ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ عرب ممالک کے الگ الگ جغرافیائی حدود اور اُن کے اندر رہنے والی مختلف نسلیں بھی چھوٹی چھوٹی قومیتوں کو جنم دے سکتی ہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ جب اسلامی قومیت کی تشکیل میں اسلام کو خارج کر دیا جائے تو پھر اہلِ مغرب نے جن دوسری بنیادوں پر قوم پرستی کی تحریک شروع کی ہے اُن میں سے کسی بنیاد کا بھی سہارا لیا جا سکتا ہے۔ زبان اس معاملے میں کوئی واحد اساس نہیں، زبان کے علاوہ اور بہت سی بنیادیں بھی ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ یہی ہوا کہ عرب ممالک نے زبان کی بنیاد پر اکٹھے ہونے کے بجائے جغرافیائی حدود کی اساس پر اپنے آپ کو ایک دوسرے سے الگ کر لیا اور ان کے مابین اسی نوعیت کی نفرت اور عداوت پیدا ہوئی جو مغرب کی جارحانہ قوم پرستی نے مختلف قوموں کے درمیان پیدا کی ہے۔ مگر کمال دیکھیے اسرائیل کے نفسیاتی ہتھکنڈوں کا کہ عرب شکست کھانے کے بعد بھی شکست کے اس بنیادی سبب کو سمجھنے سے قاصر رہے اور اُن کی نظریں ہر پھر کر ان وجوہ کی طرف جاتی رہیں جن کی حیثیت بیماری کی علامات کی سی تھی، بیماری کے اصل سبب کی نہ تھی۔

ان مختلف نفسیاتی ہتھکنڈوں میں تیسرا نفسیاتی ہتھکنڈا یہ ہوتا ہے کہ شکست خوردہ قوم کے اندر کسی مدبر، عاقبت اندیش اور باصلاحیت قیادت کو اُبھرنے نہیں دیا جاتا اور ایسی قیادت کو اس قوم پر مسلط رکھنے کا التزام کیا جاتا ہے جو عوام کے جذبات سے کھیل سکے یا زیادہ صحیح الفاظ میں اُن کا دل بہلا سکے مگر اس میں تعمیری کام کرنے کی نہ تو کوئی امنگ ہو اور نہ صلاحیت۔ البتہ اسے معاشرے میں

سنسنی خیزی پیدا کرنے اور اپنی شخصیت کو مصنوعی طور پر اُبھارنے اور اسے عوام کی توجہ کا مرکز بنانے کا فن ضرور آتا ہو۔ اس قسم کی قیادت سے دشمن تین طرح کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ ایک تو قوم قائدین کی پیروی میں غیر سنجیدہ ہو جاتی ہے اور اس میں غور و فکر کی صلاحیتیں پروان چڑھنے کے بجائے مفلوج ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ دوسرے قوم کا جتنا قیمتی وقت اس نوعیت کی غیر سنجیدہ سرگرمیوں میں گزرتا ہے وہ ضائع ہوتا ہے۔ اور اس کے ساتھ اس کی تعمیری قوتیں بھی بیکار رہنے کی وجہ سے زنگ آلود ہو جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پوری قوم غیر سنجیدہ روش کو اپنا مستقل طرزِ عمل بنا لیتی ہے۔ اور اس طرح دشمن اس مفتوح قوم کے انتقام سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتا ہے کیونکہ کوئی غیر سنجیدہ قیادت اور کوئی غیر سنجیدہ قوم دنیا میں کوئی تعمیری کام سر انجام نہیں دے سکتی۔ تیسرے قائدین اور قوم کی ان غیر سنجیدہ حرکات کی وجہ سے پوری دنیا میں مفتوح قوم کا بچا کھچا وقار بھی گر جاتا ہے اور کوئی باوقار اور آبرومند قوم بچگانہ حرکات کرنے والی قیادت اور قوم سے کوئی معاملہ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ کسی فاتح قوم کی اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ مفتوح قوم کو ایک ایسی راہ پر لگا دینے میں کامیاب ہو جائے جس میں سنجیدہ اور تعمیری اندازِ فکر اور اندازِ عمل کا کوئی دخل نہ ہو مگر قوم اس غلط فہمی کا برابر شکار رہے کہ بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے جا رہے ہیں اور عظیم الشان تعمیری منصوبوں کی تکمیل ہو رہی ہے۔ مسخرہ پن میں اگر کسی بہت بڑے جری آمر کا پارٹ بھی ادا کیا جائے تو اس سے لوگ وقتی طور پر لطف اندوز تو ہو سکتے ہیں مگر اس ناٹک کا کوئی مستقل اثر قبول نہیں کر سکتے۔ کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ جو کچھ دکھایا جا رہا ہے وہ محض کھیل تماشا ہے اس میں حقیقت کا کوئی پہلو موجود نہیں۔

اگر آپ پاک بھارت کے درمیان حالیہ جنگ کے حالات اور واقعات پر غور کریں تو آپ کو اُن نفسیاتی حربوں کا بآسانی اندازہ ہو سکے گا جو بھارت اہلِ پاکستان کے اندر احساسِ شکست پیدا کرنے اور انہیں نظریاتی اعتبار سے بالکل تباہ کرنے کے لیے بڑی چالاکی اور عیاری سے استعمال کر رہا ہے۔ ہم میں سے کون اس حقیقت سے ناواقف ہے کہ اس برِ اعظم کی تقسیم ہی اس اصول کی بنیاد پر کی گئی تھی کہ ہندوستان کی دوسری اقوام کی قومیت کی تشکیل میں خواہ مذہب کا کوئی عنصر شامل ہو یا نہ ہو مگر مسلم قومیت کا خمیر اسلام اور صرف اسلام سے اٹھایا گیا ہے۔ اسلام مسلمانوں کے لیے صرف انفرادی ضابطۂ اخلاق ہی

نہیں بلکہ اُن کی اجتماعی زندگی کا بھی واحد محرک ہے۔ مسلمانوں کے اسلام کے ساتھ اس گہرے اور ہمہ گیر تعلق کو ہٹا کر دیکھیے تو پاکستان کا وجود بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی تعلق کی بنا پر یہ ملک معرضِ وجود میں آیا، اسی تعلق کی بنیاد پر پاکستان کو ایک الگ ملک کی حیثیت سے زندہ رہنے کا حق حاصل ہے اور اسی تعلق پر اس کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ بھارت کے وجود کی تو متعدد سیاسی اور معاشرتی وجوہ بھی ہو سکتی ہیں۔ مگر پاکستان کے وجود کے لیے اسلام کے سوا کوئی دوسرا جواز نہیں۔ اس پس منظر میں اب ان نفسیاتی ہتھکنڈوں کا جائزہ لیجیے جو پاکستان کے خلاف استعمال کیے جا رہے ہیں۔

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بھارت بلکہ اس کے ہمنوا ممالک کی پوری پراپیگنڈہ مشینری پاکستانی باشندوں کے دلوں میں یہ خیال بٹھانے کی کوشش کر رہی ہے کہ مذہب کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کا تصور جس کی بنا پر پاکستان قائم ہوا معاذاللہ ایک باطل خیال ہے کیونکہ اگر یہ خیال درست ہوتا تو آج مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے ٹوٹ کر بھارت سے جڑنے پر کبھی آمادہ نہ ہوتا۔ بھارت کے معروف سیاستدانوں اور مشرقی پاکستان کے بعض سربراہوں نے اور دنیا کے پریس نے الفاظ کے تھوڑے سے تغیر و تبدل کے ساتھ اس باطل خیال کا بار بار اظہار کیا ہے اور ابھی تک کہا جا رہا ہے کہ تقسیم ملک کی یہ بنیاد ہی غلط تھی جسے اب حقائق نے غلط اور غیر حقیقت پسندانہ ثابت کر دیا۔ بیسویں صدی میں قومیت مذہب سے عبارت نہیں ہوتی، بلکہ دوسرے مادی عناصر سے تشکیل پاتی ہے جن میں جغرافیائی حد بندیاں، رنگ و نسل اور زبان کے اختلافات اور اُن سب سے بڑھ کر کسی خطۂ ارض کے رہنے والوں کے معاشی مفادات فیصلہ کُن اہمیت کے حامل ہیں۔ مشرقی پاکستان جو مغربی پاکستان سے الگ ہو گیا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ان دونوں خطوں کے رہنے والوں کے مابین یہ سارے اختلافات نمایاں طور پر موجود ہیں۔ اُن کے رنگ ایک دوسرے سے جُدا ہیں، ان کی زبانیں ایک دوسرے سے الگ ہیں اور اُن کے معاشی مفادات ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور قومیت کے یہ مادی عناصر مذہبی اور روحانی عناصر سے کہیں زیادہ طاقتور ہیں اس لیے دورِ حاضر میں جو لوگ مذہب کی اساس پر قومیت کی تشکیل کرنے پر مُصر ہیں وہ یا تو خواب و خیال کی دنیا میں رہنے والے احمق ہیں یا ایسے عیّار افراد ہیں جو مذہب کے نام پر دوسرے لوگوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتے ہیں مگر چونکہ حماقت اور عیّاری دونوں میں سے کوئی بھی مدّتِ دراز تک کامیاب نہیں ہو سکتی اس لیے

مشرقی پاکستان کے طرزِ عمل نے اُن کی سادگی اور چالاکی کا پردہ چاک کر دیا ہے۔ یہ ہے مختصر الفاظ میں وہ طرزِ فکر اور طرزِ استدلال جس کی بنیاد پر پاکستان کی نظریاتی بیخ کنی کی جا رہی ہے۔ جو لوگ اس ناپاک مہم کو چلا رہے ہیں اُنہیں اس بات کا پختہ یقین ہے کہ اگر ایک مرتبہ پاکستان کی نظریاتی اساس مسمار کر دی جائے تو پھر مغربی پاکستان کا وجود بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ جُوں جُوں یہ غلط اندازِ فکر عوام کے اندر جڑ پکڑتا چلا جائے گا اسی رفتار سے پاکستان کی بنیاد متزلزل ہو گی اور جلد ہی پاکستان کی پُوری عمارت پیوندِ خاک ہو جائے گی۔ پاکستان اور بیرونِ پاکستان جو لوگ سیکولر ذہن کے ساتھ اس خطۂ ارضِ پاک کے معرضِ وجود میں آنے پر غور کرتے ہیں وہ اسے تاریخ کا ایک عظیم المیہ قرار دیتے ہیں کیونکہ اس سے قومیت کے سارے غیر اسلامی فلسفوں کا ابطال ہوتا ہے اور اس کی نظریاتی اساس کے ضعف سے اُن کے نزدیک قومیت کے ملحدانہ نظریات کو تقویت پہنچتی ہے۔ اس لیے نہ صرف بھارت بلکہ دنیا کی ساری اسلام دشمن طاقتیں اس نیم برِاعظم میں بسنے والے مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کو کچھ اس انداز میں پیش کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں کہ اس مادّی دَور میں ایک سر پھری قوم نے جنوں کے عالم میں مذہب کی بنیاد پر ایک الگ خطۂ ارض کی آرزو کی اور اپنی اس آرزو کو پُورا کرنے کے لیے اُس نے آگ اور خُون کے مہیب سمندر میں گزرنا گوارا کیا لیکن چونکہ اس کی یہ آرزو کسی دیوانے کے خواب سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی۔ اس لیے اس کی یہ آرزو پُوری طرح پایۂ تکمیل تک پہنچنے سے پہلے ہی خوابِ پریشاں بن کر منتشر ہو گئی۔

بدقسمتی سے یہاں گزشتہ ۲۴ سال سے جو کچھ ہو رہا ہے اُس سے باطل قوتوں کے یہ اندیشے غلط ثابت ہونے کے بجائے صحیح ثابت ہو رہے ہیں۔ اس لیے دشمن کا پراپیگنڈا بھی بڑا مؤثر اور کارگر ثابت ہو رہا ہے۔ خوش فہمیوں میں مبتلا رہنے والے ذہن جو چاہیں کہتے رہیں لیکن اس تلخ حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم نے جس بنیاد پر پاکستان حاصل کیا تھا اس بنیاد کو ہم نے اپنے غلط طرزِ عمل سے خود غلط ثابت کر دکھایا ہے۔ اور اسی وجہ سے ہماری ساکھ کو بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ ہمارے بارے میں دنیا میں اب یہ عام تاثر پایا جاتا ہے کہ ہم ایک جذباتی قوم ہیں جسے حقائق سے مُنہ موڑنے اور خوابوں کے محلات تعمیر کرنے میں لذت محسوس ہوتی ہے اس لیے ہم کوئی تعمیری کام نہیں کر سکتے۔ ہمارے بارے میں اس تاثر کی وجہ سے ہم اپنے آپ کو آج تنہا پاتے ہیں۔

دشمن کے اس غلط پراپگنڈے کے مضر اثرات ہم ہیں ہر شخص خود مغربی پاکستان میں بھی بڑی شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہے۔ ہماری قومیت کی اسلامی بنیاد کمزور ہونے کی وجہ سے مغربی پاکستان بھی پوری طرح خلفشار کی زد میں ہے اور جو لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہیں وہ یا تو سخت کوتاہ اندیش ہیں یا ملک کے بدخواہ، کیونکہ وہ ایسے طوفان کی تباہ کاریوں سے صرفِ نظر کر رہے ہیں جس نے حال ہی میں ہمیں شدید نقصان پہنچایا ہے۔ اسلامی قومیت کے بارے میں جو بات بھارت اور بعض دوسرے سیکولر ممالک کہتے ہیں وہی بات آج بعض نام نہاد مسلمانوں کی زبانوں سے بھی سنی جا رہی ہے کہ ہمیں اسلام کے تصورِ قومیت کو ترک کر کے پاکستانی قوم کی تعمیر کے لیے ایسی مادی بنیادوں کو تلاش کرنا چاہیے جو ہمیں دوسری قوموں کے ساتھ نظریاتی اعتبار سے ہم آہنگ کر دیں۔ ان بنیادوں کی باقاعدہ نشاندہی بھی کی جا رہی ہے۔ کوئی صاحب پاکستان کے مختلف حصوں کے علاقائی کلچر کو قومیت کی اساس ٹھہرانے پر مصر ہیں، کوئی علاقائی بولیوں کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں۔ اور کوئی مختلف علاقوں کے مادی مفادات کا سہارا لے کر مختلف قومیتوں کو معرضِ وجود میں لانے کا منصوبہ تیار کر رہے ہیں۔ اس قسم کے باطل افکار و نظریات کی نشر و اشاعت کا اثر یہ ہے کہ مغربی پاکستان کے بارے میں بھی اب کچھ لوگ یہ بات ڈھٹائی سے کہہ رہے ہیں کہ پاکستان ایک قومیت کا نہیں بلکہ چار مختلف قومیتوں کا وطن ہے۔ اور اگر اس حقیقت کو نظر انداز کر کے پاکستان کو ایک ملت کا وطن سمجھ کر یہاں اجتماعی معاملات کو طے کرنے کی کوشش کی گئی تو اس حصے کا بھی وہی حشر ہو گا جو مشرقی پاکستان کا ہوا ہے۔ یہ پراپگنڈا اس چالاکی اور عیاری اور اس ہنر مندی کے ساتھ کیا جا رہا ہے کہ ایک عام آدمی کو اس کا شعور تک نہیں ہوتا۔ پاکستان کی نوخیز نسلیں جنہوں نے مغربی طرز کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی ہے اور جو مغربی مفکرین کے افکار و نظریات پر پورا پورا ایمان رکھتی ہیں وہ اس مکروہ پروپگنڈے سے بری طرح متاثر ہو رہی ہیں اور اسلامی قومیت کے بارے میں اس غلط خیال کو ایک ناقابلِ تردید سچائی کی حیثیت سے قبول کرتی چلی جا رہی ہے۔ اگر یہ زہر جس کے اثرات ابھی ایک خاص طبقے تک محدود ہیں مغربی پاکستان کے رگ و پے میں سرایت کرنے میں کامیاب ہو گیا تو پھر مغربی پاکستان کو بھی کوئی چیز تباہی سے بچا نہ سکے گی۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کے مسلمانوں کو اس تباہی سے محفوظ رکھے مگر حالات کا دھارا جس رُخ بہ رہا ہے اُسے دیکھتے ہوئے سخت تشویش لاحق ہوتی ہے، کیونکہ اس رُخ پر بربادی کے نہایت واضح نشانات ملتے ہیں اور عقل بھی ان خدشات اور اندیشوں کی پوری

طرح تصدیق کرتی ہے۔ بات بالکل واضح ہے کہ اگر مسلمان اسلام کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک ملت کی حیثیت سے زندہ رہنا پسند نہیں کرتے اور اپنی شیرازہ بندی، خاک و خون کی بنیاد پر کرنا چاہتے ہیں تو پھر ان کا منتشر ہونا ایک قدرتی امر ہے بلکہ اُن کا متحد رہنا ایک امر محال ہے۔ جن لوگوں نے مسلمانوں کی اجتماعیت کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ دنیا کی جو قوم ملتِ اسلامیہ کے نام سے موسوم ہے وہ مختلف علاقوں، مختلف نسلوں، مختلف رنگوں کے افراد پر مشتمل ہے۔ انہیں رنگ و نسل کے وسیع اختلاف کے باوجود ایک دوسرے سے جوڑنے والی قوت محض اسلام ہے جب آپ اس قوتِ رابطہ کو توڑ دیں گے تو ملت کے اجزا لازمی طور پر بکھر کر رہ جائیں گے۔ اسلام دشمن طاقتیں اسی نہج پر کام کر رہی ہیں۔ دشمن کے اس حربے کو ناکام بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہماری جس بنیاد کو وہ ڈھا رہی ہیں ہم اس کی پوری قوت سے حفاظت کریں۔

دشمن کا دوسرا نفسیاتی ہتھکنڈا جس کا ہم نے گذشتہ صفحات میں ذکر کیا ہے یہ ہے کہ پہلے مرحلے پر تو اسبابِ شکست کے بارے میں پریشان خیالی پیدا کی جائے تاکہ نہ تو شکست خوردہ قوم ان کی صحیح طور پر نشاندہی کر سکے اور نہ ان کے تدارک کا اہتمام کر سکے کیونکہ جب تک کوئی طبیب مرض کی صحیح طور پر تشخیص نہ کرے اس وقت تک وہ صحیح علاج نہیں کر سکتا۔ جو لوگ امت کے مزاج سے اچھی طرح آشنا ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اسلام کے بارے میں ہماری منافقانہ روش نے ہمیں تباہی سے دوچار کیا ہے۔ اسلام سے بے تعلقی بلکہ بعض حالات میں بغاوت کی وجہ سے ہم باری تعالیٰ کی تائید و نصرت سے محروم ہو گئے ہیں، ہمارا اخلاق تباہ ہو گیا ہے ہمارے اندر فسق و فجور نے زور پکڑا ہے اور ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اُن منکرات کو راہ پانے کا موقع ملا ہے جنہیں اسلام دنیا سے مٹانے کے لیے آیا ہے ہم نے بندگیِ رب کے صحیح طرزِ عمل کو چھوڑ کر خدا سے سرکشی کی راہ اختیار کی ہے ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کو اپنا سرمایۂ حیات بنانے کے بجائے مغربی افکار و نظریات پر فریفتہ ہونا سیکھا ہے۔ ہم نے اسلامی اخلاق کو اپنانے کے بجائے مغربی اخلاق کا نمونہ بننے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے اسلامی حدود کو بڑی بے دردی سے پامال کیا ہے اور اسے روشن خیال اور ترقی پسندی سمجھا ہے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ منکرات کا زہر ہماری زندگی کے سارے گوشوں میں سرایت کر رہا ہے۔ آرٹ اور کلچر کے نام پر

ہمارے ہاں بے حیائی کو فروغ دینے کے مواقع فراہم کیے گئے، تفریح کی آڑ میں ہماری قوم کے ایک اچھے خاصے طبقے کو شاہد و شراب کا لذت آشنا بنایا گیا اور آہستہ آہستہ ہماری زندگی سے وہ ساری خوبیاں ناپید ہونے لگیں جو ہمارا سرمایۂ حیات تھیں اور جن کی وجہ سے ہم دنیا میں سربلند تھے اور اُن کی جگہ وہ ساری بُرائیاں ہمارے ہاں رواج پانے لگیں جن کے استیصال کے لیے ہمیں اللہ تعالیٰ نے امتِ وسط کے بلند منصب سے سرفراز فرمایا ہے۔

تاریخ کے اوراق اس حقیقت کی شہادت فراہم کرتے ہیں کہ کسی قوم کی ترقی خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، اپنے نصب العین سے گہری محبت اور اس کے تقاضوں کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی ڈھالنے سے ہی وابستہ ہے۔ کسی قوم کا جس نسبت سے اپنے نصب العین سے عشق ہوگا اسی تناسب سے اس کے اندر زندگی کی حرارت اور ولولہ پیدا ہوگا۔ چنانچہ ایک ایسی قوم جس کا اپنے نصب العین سے بس اتنا ہی تعلق ہو کہ وہ کبھی کبھار زبان سے اس کا تذکرہ کر دے مگر اس کی زندگی میں اس نصب العین کی کوئی جھلک موجود نہ ہو بلکہ اُس کی حیات کے سارے گوشوں میں اس نصب العین کے برعکس دوسرے نظریات کے رنگ نمایاں ہوں تو اس کے بارے میں یہ سوچنا کہ یہ دنیا کی کوئی عظیم قوم بن سکتی ہے بہت بڑی حماقت ہے۔ دورنگی اور منافقت نہ صرف کسی قوم کے اساسی تصورات میں انتشار اور عمل میں اضمحلال پیدا کرتی ہے بلکہ اس کے اندر دوسری اقوام کی بُرائیوں کو قبول کرنے کی راہیں ہموار کرتی ہے۔ نصب العین کے ساتھ یہ منافقانہ تعلق قوموں کو بلندی کی طرف نہیں بلکہ پستی کی طرف لے جاتا ہے۔

یہ ہے سیدھا سا تجزیہ ہماری شکست کا مگر دادِ دیجیے دشمنوں کے نفسیاتی ہتھکنڈوں کی کہ ہمارے ذہنوں کو اس صحیح تجزیے کی طرف منتقل ہی نہیں ہونے دیا جا رہا کہ کہیں ہم مرض کا صحیح طور پر مداوا نہ کر سکیں۔ ہماری سوچ کو بڑی عیاری کے ساتھ اسبابِ شکست کی تلاش کے معاملے میں بھی بڑی غلط راہ پر ڈالا جا رہا ہے۔ اس چالاکی اور عیّاری کی یُوں تو متعدد مثالیں دی جا سکتی ہیں مگر یہاں ہم صرف ایک مثال درج کرتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کا سانحہ جن بدکردار اور عیاش حکمرانوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے پیش آیا ہے اس سے عوام کے اندر شراب و شاہد کے بارے میں شدید بیزاری پیدا ہوتی ہے اور لوگوں پر یہ تلخ حقیقت آشکارا ہوئی ہے کہ غیر اسلامی طرزِ زندگی نے ہمارے اخلاق کو تباہ کیا ہے اور اخلاق کی تباہی ملک کی تباہی پر منتج ہوئی ہے۔ غور و فکر کے اس انداز سے دشمنوں کو اس بات کا شدید خطرہ لاحق ہوا کہ

کہیں فسق و فجور سے عوام کی یہ بیزاری ان کے اندر اسلامی نظامِ حیات کے حق میں کوئی تعمیری جذبہ نہ بیدار کردے اور وہ اسلام سے انحراف کی راہ چھوڑ کر کہیں عزم کے ساتھ اسلام کی راہ پر نہ چل نکلیں۔ اس خطرہ کی پیش بندی کے لیے عجیب و غریب حربے استعمال کیے جارہے ہیں کہیں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ آخر مغربی قومیں بھی تو شراب و شاہد کی رسیا ہیں ان کے حصے میں یہ ذلت و خواری کیوں نہیں آئی۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ بھارت بھی تو آخر اس بُرائی سے یکسر پاک نہیں پھر اسے کیوں فتح نصیب ہوئی ہے اور ہمارے حصے میں شکست آئی ہے۔ کبھی یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ شراب انسان کے قویٰ کو مضمحل نہیں کرتی بلکہ ان کے اندر توانائی پیدا کرتی ہے، کبھی دنیا کی معروف شخصیتوں اور نامور سپہ سالاروں کی نشاندہی کرکے ان کے بارے میں یہ انکشاف کیا جاتا ہے کہ ان کا دامن بھی ان بُرائیوں سے داغدار تھا۔ ان سارے نفسیاتی حربوں کے استعمال کرنے کا مقصد بجز اس کے اور کیا ہے کہ قوم کے اندر شکست کے بعد اپنے اخلاقی انحطاط کا وقتی طور پر جو احساس بیدار ہوا ہے اور اس کے نتیجے میں جو ایک خوشگوار ردِّعمل پیدا ہونے کے امکانات روشن ہوئے ہیں انہیں ختم کر دیا جائے۔ ہم یہ بات باور کرنے سے قاصر ہیں کہ جو لوگ اس قسم کی بیہودہ باتیں کر رہے ہیں وہ حقیقت سے ناواقف ہیں اور اس عظیم فرق کو سمجھنے سے معذور ہیں جو مغربی قوموں کے مزاج اور ایک مسلمان قوم کے مزاج کے درمیان پایا جاتا ہے۔ شراب و شاہد سے تعلق نے دنیا کی کسی قوم کو فائدہ نہیں پہنچایا بلکہ اس کی تباہی کا سامان ہی فراہم کیا ہے۔ فرانس کی شکست کے بعد وہاں کے مفکرین نے جب اپنی اس بربادی پر غور کیا تو انہوں نے اس حقیقت کا نہایت واضح طور پر اعتراف کیا کہ فرانسیسی قوم کی تباہی میں ان دو بُرائیوں کا بڑا عمل دخل تھا۔ مغربی مفکرین اور اطباء میں سے کوئی ایک ایسا نامور مفکر یا طبیب نظر نہیں آتا جس نے ان بُرائیوں کی ضرر رسانیوں سے انکار کیا ہو۔ البتہ ہمارے ہاں بعض ایسے بزرجمہر پائے جاتے ہیں جو ان بُرائیوں میں بھی بھلائی کے متعدد پہلو دیکھتے ہیں۔

باقی رہا یہ استدلال کہ اگر مغربی اقوام ان بُرائیوں کے ہوتے ہوئے بھی ترقی کی راہ پر گامزن ہیں تو ہم ایسا کیوں نہیں کرسکتے، یہ خود اسے پیش کرنے والوں کی فکری بے مائیگی کی شہادت فراہم کرتا ہے۔ یہ استدلال اس غلط مفروضے پر مبنی ہے کہ کسی قوم کے نصب العین اور اس کے ضابطۂ اخلاق کے مابین کوئی گہرا ربط نہیں ہوتا۔ قوم کسی نصب العین کے ساتھ جو ضابطۂ اخلاق بھی چاہے اپنا سکتی ہے (باقی صفحہ

تفہیم القرآن

العلق

نام | دوسری آیت کے لفظ عَلَق کو اس سورۃ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول | اس سورۃ کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ اِقْرَاْ سے شروع ہو کر پانچویں آیت کے الفاظ مَا لَمْ یَعْلَمْ پر ختم ہوتا ہے، اور دوسرا حصہ کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی سے شروع ہو کر آخر سورۃ تک چلتا ہے۔ پہلے حصے کے متعلق علمائے اُمت کی عظیم اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ یہ سب سے پہلی وحی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ اِس معاملہ میں حضرت عائشہؓ کی وہ حدیث جسے امام احمد، بخاری، مسلم اور دوسرے محدثین نے متعدد سندوں سے نقل کیا ہے، صحیح ترین احادیث میں شمار ہوتی ہے، اور اس میں حضرت عائشہ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر آغاز وحی کا پورا قصہ بیان کیا ہے۔ اِس کے علاوہ ابن عباسؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ اور صحابہؓ کی ایک جماعت سے بھی یہی بات منقول ہے کہ قرآن کی سب سے پہلی آیات جو حضورؐ پر نازل ہوئیں وہ یہی تھیں۔ دوسرا حصہ بعد میں اُس وقت نازل ہوا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم میں نماز پڑھنی شروع کی اور ابوجہل نے آپ کو دھمکیاں دے کر اس سے روکنے کی کوشش کی۔

آغازِ وحی | محدثین نے آغاز وحی کا قصہ اپنی اپنی سندوں کے ساتھ امام زُہری سے، اور انہوں نے حضرت عُروہ بن زُبیر سے اور انہوں نے اپنی خالہ حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے۔ وُہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا سچے (اور بعض روایات میں ہے اچھے) خوابوں کی شکل میں ہوئی۔ آپ جو خواب بھی دیکھتے وہ ایسا ہوتا کہ جیسے آپ دن کی روشنی میں دیکھ رہے ہیں۔ پھر آپ تنہائی پسند ہو گئے اور کئی کئی شب و روز غارِ حرا میں رہ کر عبادت کرنے لگے (حضرت عائشہؓ

نے تَحَنُّث کا لفظ استعمال کیا ہے جس کی تشریح امام زُہری نے تعبُّد سے کی ہے۔ یہ کسی طرح کی عبادت تھی جو آپ کرتے تھے، کیونکہ اُس وقت تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو عبادت کا طریقہ نہیں بتایا گیا تھا)۔ آپ کھانے پینے کا سامان گھر سے لے جا کر وہاں چند روز گزارتے، پھر حضرت خدیجہ کے پاس واپس آتے اور وہ مزید چند روز کے لیے سامان آپ کے لیے مہیا کر دیتی تھیں۔ ایک روز جبکہ آپ غارِ حرا میں تھے، یکایک آپ پر وحی نازل ہوئی اور فرشتے نے آکر آپ سے کہا پڑھو۔ اس کے بعد حضرت عائشہؓ خود رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نقل کرتی ہیں کہ مَیں نے کہا "مَیں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں"۔ اس پر فرشتے نے مجھے پکڑ کر بھینچا یہاں تک کہ میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ مَیں نے کہا "مَیں تو پڑھا ہُوا نہیں ہوں"۔ اس نے دوبارہ مجھے بھینچا اور میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ مَیں نے پھر کہا "مَیں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں"۔ اس نے تیسری مرتبہ مجھے بھینچا یہاں تک کہ میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ (پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا) یہاں تک کہ مَا لَمْ یَعْلَمْ (جسے وہ نہ جانتا تھا) تک پہنچ گیا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کانپتے لرزتے ہوئے وہاں سے پلٹے اور حضرت خدیجہ کے پاس پہنچ کر کہا "مجھے اُڑھاؤ مجھے اُڑھاؤ" چنانچہ آپ کو اُڑھا دیا گیا۔ جب آپ پر سے خوف زدگی کی کیفیت دُور ہو گئی تو آپؐ نے فرمایا "اے خدیجہ، یہ مجھے کیا ہو گیا ہے"۔ پھر سارا قصہ آپ نے اُن کو سنایا اور کہا "مجھے اپنی جان کا ڈر ہے"۔ انہوں نے کہا ہرگز نہیں، آپ خوش ہو جائیے، خدا کی قسم، آپ کو خدا کبھی رُسوا نہ کرے گا۔ آپ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، (ایک روایت میں یہ اضافہ ہے ——— کہ امانتیں ادا کرتے ہیں)، بے سہارا لوگوں کا بار برداشت کرتے ہیں، نادار لوگوں کو کما کر دیتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، اور نیک کاموں میں مدد کرتے ہیں"۔ پھر وہ حضورؐ کو ساتھ لے کر وَرَقہ بن نوفل کے پاس گئیں جو اُن کے چچا زاد بھائی تھے، زمانۂ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے، عربی اور عبرانی میں انجیل لکھتے تھے، بہت بوڑھے اور نابینا ہو گئے تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے اُن سے کہا بھائی جان، ذرا اپنے بھتیجے کا قصہ سُنیے۔ وَرَقہ نے حضورؐ سے کہا بھتیجے تم کو کیا نظر آیا؟ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے جو کچھ دیکھا تھا وہ بیان کیا۔ ورقہ نے کہا " یہ وہی ناموس (وحی لانے والا فرشتہ) ہے جو اللہ نے موسیٰ پر نازل کیا تھا۔ کاش میں آپ کے زمانۂ نبوت میں قوی ہوتا۔ کاش میں اُس وقت زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی۔" رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا " کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے ؟" ورقہ نے کہا " ہاں، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی شخص وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپ لائے ہیں اور اُس سے دشمنی نہ کی گئی ہو۔ اگر میں نے آپ کا وہ زمانہ پایا تو میں آپ کی پُرزور مدد کروں گا۔" مگر زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا۔

یہ قصّہ خود اپنے مُنہ سے بول رہا ہے کہ فرشتے کی آمد سے ایک لمحہ پہلے تک بھی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اس بات سے خالی الذہن تھے کہ آپ نبی بنائے جانے والے ہیں۔ اِس چیز کا طالب یا متوقع ہونا تو درکنار، آپ کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ ایسا کوئی معاملہ آپ کے ساتھ پیش آنے گا۔ وحی کا نزول اور فرشتے کا اس طرح سامنے آنا آپ کے لیے اچانک ایک حادثہ تھا جس کا پہلا تاثر آپ کے اوپر وہی ہوا جو ایک بے خبر انسان پر اتنے بڑے ایک حادثہ کے پیش آنے سے فطری طور پر ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ اسلام کی دعوت لے کر اُٹھے تو مکّہ کے لوگوں نے آپ پر ہر طرح کے اعتراضات کیے، مگر اُن میں کوئی یہ کہنے والا نہ تھا کہ ہم کو تو پہلے ہی یہ خطرہ تھا کہ آپ کوئی دعویٰ کرنے والے ہیں کیونکہ آپ ایک مدت سے نبی بننے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

اِس قِصّے سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ نبوت سے پہلے آپ کی زندگی کیسی پاکیزہ تھی اور آپ کا کردار کتنا بلند تھا۔ حضرت خدیجہ کوئی کم سن خاتون نہ تھیں بلکہ اِس واقعہ کے وقت ان کی عمر ۵۵ سال تھی اور پندرہ سال سے وہ حضورؐ کی شریکِ زندگی تھیں۔ بیوی سے شوہر کی کوئی کمزوری چھپی نہیں رہ سکتی۔ انہوں نے اِس طویل ازدواجی زندگی میں آپ کو اتنا عالی مرتبہ انسان پایا تھا کہ جب حضورؐ نے اُن کو غارِ حرا میں پیش آنے والا واقعہ سنایا تو بلا تأمل انہوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ فی الواقع اللہ کا فرشتہ ہی آپ کے پاس وحی لے کر آیا تھا۔ اِسی طرح ورقہ بن نوفل بھی مکّہ کے ایک بوڑھے باشندے تھے، بچپن سے حضورؐ کی زندگی دیکھتے چلے آرہے تھے، اور پندرہ سال کی قریبی رشتہ داری کی بنا پر تو وہ آپ کے حالات سے اور بھی زیادہ گہری واقفیت رکھتے تھے۔ اُنہوں نے بھی جب یہ واقعہ سُنا تو اِسے کوئی وسوسہ نہیں سمجھا بلکہ سنتے ہی کہہ دیا کہ یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰ علیہ السلام

پر نازل ہوا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک بھی آپ اتنے بلند پایہ انسان تھے کہ آپ کا نبوت کے منصب پر سرفراز ہونا کوئی قابلِ تعجب امر نہ تھا۔

دوسرے حصّہ کی شانِ نزول | اس سورہ کا دوسرا حصّہ اُس وقت نازل ہوا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حَرَم میں اسلامی طریقہ پر نماز پڑھنی شروع کی اور ابوجہل نے آپ کو ڈرا دھمکا کر اس سے روکنا چاہا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ نبی ہونے کے بعد قبل اس کے کہ حضورؐ اسلام کی علانیہ تبلیغ کا آغاز کرتے، آپ نے حَرَم میں اُس طریقے پر نماز ادا کرنی شروع کر دی جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھایا تھا، اور یہی وہ چیز تھی جس سے قریش نے پہلی مرتبہ یہ محسوس کیا کہ آپ کسی نئے دین کے پیرو ہو گئے ہیں۔ دوسرے لوگ تو اسے حیرت ہی کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، مگر ابوجہل کی رگِ جاہلیت اس پر پھڑک اُٹھی اور اُس نے آپ کو دھمکانا شروع کر دیا کہ اس طریقے پر حرم میں عبادت نہ کریں۔ چنانچہ اس سلسلے میں کئی احادیث حضرت عبداللہؓ بن عباس اور حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہیں جن میں ابوجہل کی ان بیہودہ گیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ ابوجہل نے قریش کے لوگوں سے پوچھا "کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے سامنے زمین پر اپنا منہ ٹکاتے ہیں؟" لوگوں نے کہا ہاں۔ اس نے کہا "لات اور عُزّیٰ کی قسم، اگر میں نے ان کو اس طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا تو ان کی گردن پر پاؤں رکھ دوں گا اور ان کا منہ زمین میں رگڑ دوں گا۔" پھر ایسا ہوا کہ حضورؐ کو نماز پڑھتے دیکھ کر وہ آگے بڑھا تاکہ آپ کی گردن پر پاؤں رکھے، مگر یکایک لوگوں نے دیکھا کہ وہ پیچھے ہٹ رہا ہے اور اپنا منہ کسی چیز سے بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُس سے پوچھا گیا کہ یہ تجھے کیا ہو گیا؟ اس نے کہا میرے اور ان کے درمیان آگ کی ایک خندق اور ایک ہولناک چیز تھی اور کچھ پَر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ میرے قریب پھٹکتا تو ملائکہ اس کے چیتھڑے اڑا دیتے (احمد، مُسلم، نسائی، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن المُنذر، ابن مَردُویہ، ابُونعیم اصفہانی، بَیہقی)۔

ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ ابوجہل نے کہا اگر میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کعبہ کے پاس نماز پڑھتے دیکھ لیا تو اُن کی گردن پاؤں تلے دبا دوں گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو ملائکہ علانیہ اُسے آ پکڑیں گے (بخاری، ترمذی،

نسائی، ابنِ جریر، عبدالرزاق، عبد بن حُمَید، ابن المُنذر، ابنِ مَردُوْیَہ)۔

ابنِ عباسؓ کی ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم مقامِ ابراہیم پر نماز پڑھ رہے تھے۔ ابوجہل کا اُدھر سے گذر ہوا تو اس نے کہا اَے محمدؐ، کیا مَیں نے تم کو اِس سے منع نہیں کیا تھا؟ اور اس نے آپ کو دھمکیاں دینی شروع کیں۔ جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس کو سختی کے ساتھ جھڑک دیا۔ اس پر اس نے کہا اے محمدؐ، تم کس بل پر مجھے ڈراتے ہو۔ خدا کی قسم، اِس وادی میں میرے حامی سب سے زیادہ ہیں (احمد، ترمذی، نسائی، ابنِ جریر، ابن ابی شَیْبَہ، ابن المُنذِر، طَبرانی، ابن مَردُوْیَہ)۔

اِنہی واقعات پر اِس سورہ کا وہ حصہ نازل ہوا جو کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی سے شروع ہوتا ہے۔ قدرتی طور پر اِس حصے کا مقام وہی ہونا چاہیے تھا جو قرآن کی اِس سورۃ میں رکھا گیا ہے۔ کیونکہ پہلی وحی نازل ہونے کے بعد اسلام کا اوّلین اظہار حضورؐ نے نماز ہی سے کیا تھا اور کفّار سے آپ کی مڈبھیڑ کا آغاز بھی اِسی واقعہ سے ہوا تھا۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

پڑھو[1] (اے نبی) اپنے رب کے نام کے ساتھ[2] جس نے پیدا کیا[3]۔ جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی[4]۔ پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا[5]۔ انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا[6]۔

---

[1] جیسا کہ ہم نے دیباچہ میں بیان کیا ہے، فرشتے نے جب حضورؐ سے کہا کہ پڑھو، تو حضورؐ نے جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے نے وحی کے یہ الفاظ لکھی ہوئی صورت میں آپ کے سامنے پیش کیے تھے اور انہیں پڑھنے کے لیے کہا تھا کیونکہ اگر فرشتے کی بات کا مطلب یہ ہوتا کہ جس طرح میں بولتا جاؤں آپ اسی طرح پڑھتے جائیں، تو حضورؐ کو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔

[2] یعنی اپنے رب کا نام لے کر پڑھو، یا بالفاظِ دیگر بسم اللہ کہو اور پڑھو۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وحی کے آنے سے پہلے ہی صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا رب جانتے اور مانتے تھے۔ اسی لیے یہ کہنے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی کہ آپ کا رب کون ہے، بلکہ یہ کہا گیا کہ اپنے رب کا نام لے کر پڑھو۔

[3] مطلقاً "پیدا کیا" فرمایا گیا ہے، یہ نہیں کہا گیا کہ کس کو پیدا کیا۔ اس سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اُس رب کا نام لے کر پڑھو جو خالق ہے، جس نے ساری کائنات کو اور کائنات کی ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔

[4] کائنات کی عام تخلیق کا ذکر کرنے کے بعد خاص طور پر انسان کا ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کس حقیر حالت سے اُس کی تخلیق کی ابتدا کر کے اُسے پورا انسان بنایا۔ عَلَق جمع ہے عَلَقَة کی جس کے معنی جمے ہوئے خون کے ہیں۔ یہ وہ ابتدائی حالت ہے جو استقرارِ حمل کے بعد پہلے چند دنوں میں رونما ہوتی ہے، پھر وہ گوشت کی شکل اختیار کرتی ہے اور اس کے بعد بتدریج اس میں انسانی صورت بننے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد سوم، الحج، آیت ۵، حواشی ۵ تا ۷)

[5] یعنی یہ اُس کا انتہائی کرم ہے کہ اِس حقیر ترین حالت سے ابتدا کر کے اُس نے انسان کو صاحبِ علم بنایا جو مخلوقات کی بلند ترین صفت ہے، اور صرف صاحبِ علم ہی نہیں بنایا، بلکہ اس کو قلم کے استعمال سے لکھنے کا فن سکھایا جو بڑے پیمانے پر علم کی اشاعت، ترقی، اور نسلاً بعد نسلٍ اُس کے بقا اور تحفظ کا ذریعہ بنا۔ اگر وہ الہامی طور پر انسان کو قلم اور کتابت کے فن کا یہ علم نہ دیتا تو انسان کی علمی قابلیت ٹھٹھر کر رہ جاتی اور اُسے نشو و نما پانے، پھیلنے اور ایک نسل کے علوم دوسری نسل تک پہنچنے اور آگے مزید ترقی کرتے چلے جانے کا موقع ہی نہ ملتا۔

ہرگز نہیں۔[7] انسان سرکشی کرتا ہے اِس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے[8] (حالانکہ) پلٹنا یقیناً تیرے رب ہی کی طرف ہے[9]۔ تم نے دیکھا اُس شخص کو جو ایک بندے کو منع کرتا ہے جبکہ وہ نماز پڑھتا ہو[10]؟ تمہارا کیا خیال ہے اگر (وہ بندہ) راہِ راست پر ہو یا پرہیزگاری کی تلقین کرتا ہو؟ تمہارا کیا خیال

---

[6] یعنی انسان اصل میں بالکل بے علم تھا۔ اسے جو کچھ بھی علم حاصل ہوا اللہ کے دینے سے حاصل ہوا۔ اللہ ہی نے جس مرحلے پر انسان کے لیے علم کے جو دروازے کھولنے چاہے وہ اُس پر کھلتے چلے گئے۔ یہی بات ہے جو آیۃ الکرسی میں اس طرح فرمائی گئی ہے کہ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ "اور لوگ اُس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے سوائے اُس کے جو وہ خود چاہے" (البقرہ ۔ ۲۵۵)۔ جن چیزوں کو بھی انسان اپنی علمی دریافت سمجھتا ہے، درحقیقت وہ پہلے اس کے علم میں نہ تھیں، اللہ تعالیٰ ہی نے جب چاہا اُن کا علم اُسے دیا بغیر اِس کے کہ انسان یہ محسوس کرتا کہ یہ علم اللہ اُسے دے رہا ہے۔

یہاں تک وہ آیات ہیں جو سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر نازل کی گئیں۔ جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے، یہ پہلا تجربہ اتنا سخت تھا کہ حضورؐ اِس سے زیادہ کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ اس لیے اس وقت صرف یہ بتانے پر اکتفا کیا گیا کہ وہ رب جس کو آپ پہلے سے جانتے اور مانتے ہیں، آپ سے براہِ راست مخاطب ہے، اس کی طرف سے آپ پر وحی کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے، اور آپ کو اس نے اپنا نبی بنا لیا ہے۔ اِس کے ایک مدت بعد سورۂ مدّثّر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن میں آپ کو بتایا گیا کہ نبوت پر مامور ہونے کے بعد اب آپ کو کام کیا کرنا ہے۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد ششم، المدّثّر، دیباچہ)

[7] یعنی ایسا ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ جس خدائے کریم نے انسان پر اتنا بڑا کرم فرمایا ہے اس کے مقابلہ میں وہ جہالت برت کر وہ رویّہ اختیار کرے جو آگے بیان ہو رہا ہے۔

[8] یعنی یہ دیکھ کر کہ مال، دولت، عزت و جاہ اور جو کچھ بھی دنیا میں وہ چاہتا تھا وہ اسے حاصل ہو گیا ہے، شکر گزار ہونے کے بجائے وہ سرکشی پر اتر آتا ہے اور حدِ بندگی سے تجاوز کرنے لگتا ہے۔

[9] یعنی خواہ کچھ بھی اس نے دنیا میں حاصل کر لیا ہو جس کے بل پر وہ تمرّد اور سرکشی کر رہا ہے، آخر کار اسے جانا تو تیرے رب ہی کے پاس ہے۔ پھر اسے معلوم ہو جائے گا کہ اِس روش کا انجام کیا ہوتا ہے۔

[10] بندے سے مراد خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں۔ اِس طریقے سے حضورؐ کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی

ہے اگر (یہ منع کرنے والا شخص) حق کو جھٹلاتا اور منہ موڑتا ہو؟ کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے؟[11] ہرگز نہیں،[12] اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر اسے کھینچیں گے، اُس پیشانی کو جو جھوٹی اور سخت خطا کار ہے۔[13] وہ بلالے اپنے حامیوں کی ٹولی کو،[14] ہم بھی عذاب کے فرشتوں کو بلالیں گے۔[15]

(بنی اسرائیل-۱) "پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے بندے کو ایک رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف"۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْکِتٰبَ (الکہف-۱) "تعریف ہے اس خدا کے لیے جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی"۔ وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ یَدْعُوْهُ کَادُوْا یَکُوْنُوْنَ عَلَیْهِ لِبَدًا (الجن-۱۹) "اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ اُس کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوا تو لوگ اس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہو گئے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خاص محبت کا انداز ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر فرماتا ہے۔ علاوہ بریں اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت کے منصب پر سرفراز فرمانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھنے کا طریقہ سکھا دیا تھا۔ اس طریقے کا ذکر قرآن مجید میں کہیں نہیں ہے کہ اے نبی تم اس طرح نماز پڑھا کرو۔ لہٰذا یہ اس امر کا ایک اور ثبوت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں درج ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے آپ کو ایسی باتوں کی تعلیم دی جاتی تھی جو قرآن میں درج نہیں ہیں۔

[11] بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ہر انصاف پسند شخص مخاطب ہے۔ اُس سے پوچھا جا رہا ہے کہ تم نے دیکھی اُس شخص کی حرکت جو خدا کی عبادت کرنے سے ایک بندے کو روکتا ہے؟ تمہارا کیا خیال ہے اگر وہ بندہ راہِ راست پر ہو، یا لوگوں کو خدا سے ڈرنے اور برے کاموں سے روکنے کی کوشش کرتا ہو، اور یہ منع کرنے والا حق کو جھٹلاتا اور اُس سے منہ موڑتا ہو، تو اُس کی یہ حرکت کیسی ہے؟ کیا یہ شخص یہ روش اختیار کر سکتا تھا اگر اسے یہ معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اُس بندے کو بھی دیکھ رہا ہے جو نیکی کا کام کرتا ہے اور اس کو بھی دیکھ رہا ہے جو حق کو جھٹلانے اور اُس سے روگردانی کرنے میں لگا ہوا ہے؟ ظالم کے ظلم اور مظلوم کی مظلومی کو اللہ تعالیٰ کا دیکھنا خود اس بات کو مستلزم ہے کہ وہ ظالم کو سزا دے گا اور مظلوم کی دادرسی کرے گا۔

[12] یعنی یہ شخص جو دھمکی دیتا ہے کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھیں گے تو وہ ان کی گردن کو پاؤں سے

ہرگز نہیں، اُس کی بات نہ مانو اور سجدہ کرو اور (اپنے رب کا) قرب حاصل کرو[۱۶] ع

لع

دبا دے گا، یہ ہرگز ایسا نہ کر سکے گا۔

[۱۳] پیشانی سے مُراد یہاں پیشانی والا شخص ہے۔

[۱۴] جیسا کہ ہم نے دیباچہ میں بیان کیا ہے ابو جہل کے دھمکی دینے پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جھڑک دیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ اے محمدؐ، تم کس بل پر مجھے ڈراتے ہو، خدا کی قسم اس وادی میں میرے حمایتی سب سے زیادہ ہیں۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ یہ بلالے اپنے حمائتیوں کو۔

[۱۵] اصل میں زبانیہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو قتادہ کی تشریح کے مطابق کلامِ عرب میں پولیس کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور زَبَن کے اصل معنی دھکا دینے کے ہیں۔ بادشاہوں کے ہاں چوبدار بھی اِسی غرض کے لیے ہوتے تھے کہ جس پر بادشاہ ناراض ہو اسے وہ دھکے دے کر نکال دیں۔ پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ اپنے حمائتیوں کو بُلالے، ہم اپنی پولیس، یعنی ملائکۂ عذاب کو بُلالیں گے کہ وہ اِس کی اور اِس کے حمایتیوں کی خبر لیں۔

[۱۶] سجدہ کرنے سے مراد نماز ہے۔ یعنی اے نبی، تم بے خوف اُسی طرح نماز پڑھتے رہو جس طرح پڑھتے رہے ہو، اور اس کے ذریعہ سے اپنے رب کا قرب حاصل کرو۔ صحیح مسلم وغیرہ میں حضرت ابُوہریرہؓ کی روایت ہے کہ "بندہ سب سے زیادہ اپنے رب سے اُس وقت قریب ہوتا ہے جب وہ سجدہ میں ہوتا ہے۔" اور مُسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی یہ روایت بھی آئی ہے کہ جب رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیت پڑھتے تھے تو سجدۂ تلاوت ادا فرماتے تھے۔

تفہیم القرآن

القدر

نام | پہلی ہی آیت کے لفظ القدر کو اس سورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول | اس کے مکی اور مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ ابو حیان نے البحر المحیط میں دعویٰ کیا ہے کہ اکثر اہلِ علم کے نزدیک یہ مدنی ہے۔ علی بن احمد الواحدی اپنی تفسیر میں کہتے ہیں کہ یہ پہلی سورۃ ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی۔ بخلاف اس کے الماوَردی کہتے ہیں کہ اکثر اہلِ علم کے نزدیک یہ مکی ہے، اور یہی بات امام سیوطی نے اِتقان میں لکھی ہے۔ ابنِ مَردُویَہ نے ابنِ عباس، ابن الزُّبیر اور حضرت عائشہؓ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوئی تھی۔ سورۃ کے مضمون پر غور کرنے سے بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ اس کو مکہ ہی میں نازل ہونا چاہیے تھا، جیسا کہ ہم آگے واضح کریں گے۔

موضوع اور مضمون | اس کا موضوع لوگوں کو قرآن کی قدر و قیمت اور اہمیت سے آگاہ کرنا ہے۔ قرآن مجید کی ترتیب میں اسے سورۂ علق کے بعد رکھنے سے خود یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس کتابِ پاک کے نزول کا آغاز سورۃ علق کی ابتدائی پانچ آیات سے ہوا تھا اُسی کے متعلق اِس سورہ میں لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ وہ کس تقدیر ساز رات میں نازل ہوئی ہے، کیسی جلیل القدر کتاب ہے اور اس کا نزول کیا معنی رکھتا ہے۔

سب سے پہلے اس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے اِسے نازل کیا ہے۔ یعنی یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی تصنیف نہیں ہے بلکہ اِس کے نازل کرنے والے ہم ہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ اِس کا نزول ہماری طرف سے شبِ قدر میں ہوا ہے۔ شبِ قدر کے

دو معنی ہیں اور دونوں ہی یہاں مقصود ہیں۔ ایک یہ کہ یہ وہ رات ہے جس میں تقدیروں کے فیصلے کر دیے جاتے ہیں، یا بالفاظِ دیگر یہ کوئی معمولی رات عام راتوں جیسی نہیں ہے بلکہ یہ قسمتوں کے بنانے اور بگاڑنے کی رات ہے۔ اِس میں اِس کتاب کا نزول محض ایک کتاب کا نزول نہیں ہے بلکہ یہ وہ کام ہے جو نہ صرف قریش، نہ صرف عرب، بلکہ دنیا کی تقدیر بدل کر رکھ دے گا۔ یہی بات سُورۂ دُخان میں بھی فرمائی گئی ہے (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، سُورۂ دُخان کا دیباچہ اور حاشیہ ۳)۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ یہ بڑی قدر و منزلت اور عظمت و شرف رکھنے والی رات ہے، اور آگے اس کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ یہ ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔

اِس سے کفارِ مکہ کو گویا متنبہ کیا گیا ہے کہ تم اپنی نادانی سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کی ہوئی اِس کتاب کو اپنے لیے ایک مصیبت سمجھ رہے ہو اور کوس رہے ہو کہ یہ کیا بلا ہم پر نازل ہوئی ہے، حالانکہ جس رات کو اس کے نزول کا فیصلہ صادر کیا گیا وہ اتنی خیر و برکت کی رات تھی کہ کبھی انسانی تاریخ کے ہزار مہینوں میں بھی انسان کی بھلائی کے لیے وہ کام نہیں ہوا تھا جو اس رات میں کر دیا گیا۔ یہ بات بھی سُورۂ دخان آیت ۳ میں ایک دوسرے طریقے سے بیان کی گئی ہے اور اُس سُورہ کے دیباچے میں ہم اِس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

آخر میں بتایا گیا ہے کہ اِس رات کو فرشتے اور جبریل اپنے رب کے اذن سے ہر حکم لے کر نازل ہوتے ہیں (جسے سُورۂ دخان آیت ۴ میں امرِ حکیم کہا گیا ہے) اور وہ شام سے صبح تک سراسر سلامتی کی رات ہوتی ہے۔ یعنی اس میں کسی شر کا دخل نہیں ہوتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے تمام فیصلے بالآخر بھلائی کے لیے ہوتے ہیں، ان میں کوئی برائی مقصود نہیں ہوتی، حتیٰ کہ اگر کسی قوم کو تباہ کرنے کا فیصلہ بھی ہوتا ہے تو خیر کے لیے ہوتا ہے نہ کہ شر کے لیے۔

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

ہم نے اِس (قرآن) کو شبِ قدر میں نازل کیا ہے[1] اور تم کیا جانو کہ شبِ قدر کیا ہے؟ شبِ قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے[2]۔ فرشتے اور رُوح[3] اُس میں اپنے رب کے اِذن سے ہر حکم لے کر

---

[1] اصل الفاظ ہیں اَنْزَلْنٰهُ "ہم نے اِس کو نازل کیا ہے"۔ لیکن بغیر اِس کے کہ پہلے قرآن کا کوئی ذکر ہو، اشارہ قرآن ہی کی طرف ہے، اس لیے کہ "نازل کرنا" خود بخود اس پر دلالت کرتا ہے کہ مراد قرآن ہے۔ اور قرآن مجید میں اِس امر کی بکثرت مثالیں موجود ہیں کہ اگر سیاقِ کلام یا اندازِ بیان سے ضمیر کا مرجع خود ظاہر ہو رہا ہو تو ضمیر ایسی حالت میں بھی استعمال کر لی جاتی ہے جبکہ اُس کے مرجع کا ذکر پہلے یا بعد میں کہیں نہ کیا گیا ہو (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد پنجم، النجم، حاشیہ ۹)۔

یہاں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے قرآن کو شبِ قدر میں نازل کیا ہے، اور سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ "رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا" (البقرہ۔۱۸۵)۔ اِس سے معلوم ہوا کہ وہ رات جس میں پہلی مرتبہ خدا کا فرشتہ غارِ حرا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لے کر آیا تھا وہ ماہِ رمضان کی ایک رات تھی۔ اس رات کو یہاں شبِ قدر کہا گیا ہے اور سُورۂ دُخان میں اِسی کو مبارک رات فرمایا گیا ہے: اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ "ہم نے اسے ایک برکت والی رات میں نازل کیا ہے" (آیت ۳)۔

اِسی رات میں قرآن نازل کرنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اِس رات پورا قرآن حاملِ وحی فرشتوں کے حوالہ کر دیا گیا، اور پھر واقعات اور حالات کے مطابق وقتاً فوقتاً ۲۳ سال کے دوران میں جبریل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی آیات اور سورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کرتے رہے۔ یہ مطلب ابن عباسؓ نے بیان کیا ہے (ابن جریر، ابن المُنذِر، ابن ابی حاتم، حاکم، ابن مَرْدُوْیَہ، بیہقی)۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے نزول کی ابتدا اِس رات سے ہوئی۔ یہ امام شَعبی کا قول ہے، اگرچہ اُن سے بھی دوسرا قول وہی منقول ہے جو ابن عباسؓ کا اوپر گزرا ہے (ابن جریر)۔ بہر حال دونوں صورتوں میں بات ایک ہی رہتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے نزول کا سلسلہ اسی رات کو شروع ہوا اور یہی رات تھی جس میں سُورۂ عَلَق کی ابتدائی پانچ آیات نازل کی گئیں۔ تاہم یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن کی آیات اور سورتیں اللہ تعالیٰ اُسی وقت تصنیف نہیں فرماتا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوتِ اسلامی کو کسی واقعہ یا معاملہ میں ہدایت کی ضرورت پیش آتی تھی، بلکہ کائنات کی تخلیق سے بھی پہلے ازل میں اللہ تعالیٰ کے ہاں زمین پر نوعِ انسانی کی پیدائش، اُس میں

انبیاء کی بعثت، انبیاء پر نازل کی جانے والی کتابوں، اور تمام انبیاء کے بعد آخر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمانے اور آپ پر قرآن نازل کرنے کا پورا منصوبہ موجود تھا۔ شبِ قدر میں صرف یہ کام ہوا کہ اس منصوبے کے آخری حصے پر عملدرآمد شروع ہو گیا۔ اس وقت اگر پورا قرآن حاملینِ وحی کے حوالہ کر دیا گیا ہو تو کوئی قابلِ تعجب امر نہیں ہے۔

قدر کے معنی بعض مفسرین نے تقدیر کے لیے ہیں، یعنی یہ وہ رات ہے جس میں اللہ تعالیٰ تقدیر کے فیصلے نافذ کرنے کے لیے فرشتوں کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس کی تائید سورۂ دخان کی یہ آیت کرتی ہے فِیۡہَا یُفۡرَقُ کُلُّ اَمۡرٍ حَکِیۡمٍ "اُس رات میں ہر معاملہ کا حکیمانہ فیصلہ صادر کر دیا جاتا ہے" (آیت ۵)۔ بخلاف اِس کے امام زُہری کہتے ہیں کہ قَدر کے معنی عظمت و شرف کے ہیں یعنی وہ بڑی عظمت والی رات ہے۔ اِس معنی کی تائید اسی سورۃ کے اِن الفاظ سے ہوتی ہے کہ "شبِ قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے"۔

اب رہا یہ سوال کہ یہ کونسی رات تھی، تو اس میں اتنا اختلاف ہوا ہے کہ قریب قریب ۴۰ مختلف اقوال اِس کے بارے میں ملتے ہیں۔ لیکن علماءِ اُمّت کی بڑی اکثریت یہ رائے رکھتی ہے کہ رمضان کی آخری دس تاریخوں میں سے کوئی ایک رات شبِ قدر ہے۔ اور ان میں بھی زیادہ تر لوگوں کی رائے یہ ہے کہ وہ ستائیسویں رات ہے۔ اِس معاملہ میں جو معتبر احادیث منقول ہوئی ہیں انہیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ القدر کے بارے میں فرمایا وہ ستائیسویں یا انتیسویں رات ہے (ابوداؤد طیالسی)۔ دوسری روایت حضرت ابوہریرہؓ سے یہ ہے کہ وہ رمضان کی آخری رات ہے (مُسند احمد)۔

حضرت اُبَیؓ بن کعب سے زِرّ بن حُبَیش نے شبِ قَدر کے متعلق پوچھا تو انہوں نے حلفاً کہا اور استثناء نہ کیا کہ وہ ستائیسویں رات ہے (احمد، مُسلم، ابوداؤد، تِرمذی، نسائی، ابنِ حِبّان)۔

حضرت ابوذرؓ سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ حضرت عمرؓ، حضرت حُذَیفہ اور اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے بہت سے لوگوں کو اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ رمضان کی ستائیسویں رات ہے (ابن ابی شیبہ)۔

حضرت عُبادہ بن صامِت کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شبِ قدر رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق رات ہے۔ اکیسویں، یا تئیسویں، یا پچیسویں، یا ستائیسویں یا انتیسویں یا آخری (مُسند احمد)۔

حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اُسے رمضان کی آخری دس راتوں میں تلاش کرو جبکہ مہینہ ختم ہونے میں ۹ دن باقی ہوں، یا سات دن باقی، یا پانچ دن باقی (بخاری)۔ اکثر اہلِ علم

نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ حضورؐ کی مراد طاق راتوں سے تھی۔

حضرت ابوبکرہؓ کی روایت ہے کہ ۹ دن باقی ہوں، یا سات دن، یا پانچ دن، یا تین دن، یا آخری رات۔ مراد یہ تھی کہ ان تاریخوں میں لیلۃ القدر کو تلاش کرو (ترمذی، نسائی)۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شب قدر کو رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق رات میں تلاش کرو (بخاری، مسلم، احمد، ترمذی)۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تازیست رمضان کی آخری دس راتوں میں اعتکاف فرمایا ہے۔

اس معاملہ میں جو روایات حضرت معاویہ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن عباس وغیرہ بزرگوں سے مروی ہیں اُن کی بنا پر علمائے سلف کی بڑی تعداد ستائیسویں رمضان ہی کو شبِ قدر سمجھتی ہے۔ غالباً کسی رات کا تعیّن اللہ اور اس کے رسُول کی طرف سے اس لیے نہیں کیا گیا ہے کہ شبِ قدر کی فضیلت سے فیض اٹھانے کے شوق میں لوگ زیادہ سے زیادہ راتیں عبادت میں گزاریں اور کسی ایک رات پر اکتفا نہ کریں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس وقت مکہ معظمہ میں رات ہوتی ہے اُس وقت دنیا کے ایک بہت بڑے حصے میں دن ہوتا ہے، اس لیے اُن علاقوں کے لوگ تو کبھی شبِ قدر کو پا ہی نہیں سکتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عربی زبان میں اکثر رات کا لفظ دن اور رات کے مجموعے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس لیے رمضان کی اِن تاریخوں میں سے جو تاریخ بھی دنیا کے کسی حصّہ میں ہو اُس کے دن سے پہلے والی رات وہاں کے لیے شب قدر ہو سکتی ہے۔

؎ مفسّرین نے بالعموم اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ اس رات کا عملِ خیر ہزار مہینوں کے عملِ خیر سے افضل ہے جن میں شبِ قدر شمار نہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بات اپنی جگہ درست ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رات کے عمل کی بڑی فضیلت بیان کی ہے۔ چنانچہ بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا من قام لیلۃ القدر ایمانًا و احتسابًا غفرلہ ما تقدم من ذنبہ "جو شخص شبِ قدر میں ایمان کے ساتھ اور اللہ کے اجر کی خاطر عبادت کے لیے کھڑا رہا اس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو گئے"۔ اور مُسند احمدؒ میں حضرت عُبادہ بن صامت کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "شبِ قدر رمضان کی آخری دس راتوں میں ہے، جو شخص ان کے اجر کی طلب میں عبادت کے لیے کھڑا رہا اللہ اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دے گا"۔ لیکن آیت کے الفاظ یہ نہیں ہیں کہ العمل فی لیلۃ القدر خیر من العمل فی الف

اُترتے ہیں۔[۴] وہ رات سراسر سلامتی ہے طلوعِ فجر تک۔[۵] ع

مہینوں (شبِ قدر میں عمل کرنا ہزار مہینوں میں عمل کرنے سے بہتر ہے) بلکہ فرمایا یہ گیا ہے کہ "شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔" اور ہزار مہینوں سے مراد بھی گِنے ہوئے ۸۳ سال چار مہینے نہیں ہیں بلکہ اہلِ عرب کا قاعدہ تھا کہ بڑی کثیر تعداد کا تصور دلانے کے لیے وہ ہزار کا لفظ بولتے تھے۔ اس لیے آیت کا مطلب یہ ہے کہ اِس ایک رات میں خیر اور بھلائی کا اتنا بڑا کام ہوا کہ کبھی انسانی تاریخ کے کسی طویل زمانے میں بھی ایسا کام نہ ہوا تھا۔

[۳] رُوح سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں جن کے فضل و شرف کی بنا پر ان کا ذکر فرشتوں سے الگ کیا گیا ہے۔

[۴] یعنی وہ بطورِ خود نہیں آتے بلکہ اپنے رب کے اذن سے آتے ہیں۔ اور ہر حکم سے مراد وہی ہے جسے سورۂ دُخان آیت ۵ میں امرِ حکیم (حکیمانہ کام) کہا گیا ہے۔

[۵] یعنی شام سے صبح تک وہ پوری رات خیر ہی خیر ہے، ہر شر اور فتنے سے پاک۔

اِسلام کا شُورائی نظام

مولانا وصی مظہر ندوی

[علمی حلقوں میں اس مسئلہ پر وقتاً فوقتاً بحث کی جاتی رہی ہے کہ کیا اسلامی مملکت کا سربراہ ارکانِ شُوریٰ کی اکثریت کے فیصلے کو از روئے شریعت مسترد کرنے کا مجاز ہے یا نہیں۔ اِس ضمن میں حال ہی میں ایک مضمون دمشق کے مشہور مجلہ "حضارۃ الاسلام" میں ڈاکٹر حسن ہویدی کے قلم سے شائع ہوا۔ اس مضمون میں انہوں نے قریب قریب وہ سارے دلائل جمع کر دیئے ہیں جو امیر کو ارکانِ شُوریٰ کے فیصلے کو مسترد کرنے کا اختیار حاصل ہونے کے حق میں دیئے جاتے ہیں۔ اس مضمون کی اشاعت کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ ایک مرتبہ یہ سارے دلائل یکجا سامنے آ جائیں تو پھر انہیں نگاہ میں رکھتے ہوئے دوسرا نقطۂ نظر پیش کیا جائے۔ مگر اس مضمون کے شائع ہوتے ہی اس کے بارے میں متعدد خطوط موصول ہونے لگے جن میں بعض کا لہجہ خاصا تند و تیز تھا، چنانچہ اس مضمون کی اشاعت روک دی گئی۔ جماعتِ اسلامی کے ایک معروف عالمِ دین مولانا وصی مظہر ندوی نے اس مضمون پر بڑے علمی انداز میں تنقید فرمائی ہے جسے ان صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اِس ضمن میں مَیں یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ حسن ہویدی صاحب نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ میرے خیالات نہیں بلکہ یہ ہویدی صاحب کے خیالات ہیں۔ خاکسار نے ان کا ترجمہ جو ترجمان القرآن میں پیش کیا ہے اس کا مقصد ایک مسئلہ کی تنقیح تھا۔ کیونکہ بسا اوقات کسی مسئلہ کی وضاحت کے لیے یہ بھی ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس کے مخالف اور موافق دونوں نقطہ ہائے نظر پیش کر دیئے جائیں۔ ع - ح - س]

مذکورۂ بالا عنوان کے تحت ترجمان القرآن بابت ماہ نومبر ۱۹۷۱ء میں ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ مضمون

ڈاکٹر حسن ہویدی صاحب کا نتیجۂ فکر ہے اور ترجمہ جناب عبدالحمید صدیقی صاحب نے کیا ہے۔

اس مضمون میں جن افکار و خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، وہ اسلام کے شورائی نظام کی انتہائی غلط تصویر پیش کرتے ہیں۔ یہ افکار و نظریات دراصل سطحی مطالعہ اور قلتِ فکر کا نتیجہ ہیں۔ ترجمان القرآن جیسے علمی رسالہ میں ان کی اشاعت چند در چند غلط فہمیوں کا موجب بن سکتی ہے۔ اس لیے ان سطور میں اسلام کے شورائی نظام کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ مذکورہ بالا مضمون میں اخذ کردہ غلط نتائج پر گرفت بھی کی گئی ہے۔

اسلام نے جس نظامِ زندگی کی خیر و برکت سے انسانیت کو مالا مال کیا ہے اس کی اساس شورائیت پر قائم ہے۔ چنانچہ سورۂ شوریٰ میں اس نظامِ زندگی کے خصائص بیان کرتے ہوئے ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ[1] شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (شوریٰ - ۳۸)

اور جن لوگوں نے اپنے رب کی پکار پر لبیک کہی اور جن لوگوں نے نماز کو قائم کیا اور جن کا نظامِ حکومت باہم مشورے سے چلتا ہے اور جو ہمارے دیے ہوئے میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اس آیت میں مسلمانوں کے نظامِ زندگی میں شورائیت کو مستقل اور غیر منفک وصف ہونے کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور میں شورائیت کی روح کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ اور ان تمام باتوں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے جن سے شورائیت کو فروغ مل سکتا تھا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت و راہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی جلی اور وحی خفی کا سلسلہ جاری تھا۔ اس کے باوجود آنحضرتؐ کو حکم دیا گیا:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (آل عمران: ۱۵۸)

اور (اے نبیؐ) حکومت کے کام میں ان سے مشورہ کر لیا کرو۔ پھر جب تم کوئی فیصلہ کر لو تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے (اس فیصلہ پر عمل کرو)۔

---

[1] "امر" کا لفظ قرآن مجید میں متعدد معانی میں مستعمل ہے۔ ان میں سے ایک معنی نظامِ حکومت کے بھی ہیں۔ معنی کا تعین قرینہ سے کیا جا سکتا ہے۔ بعض مثالیں ملاحظہ ہوں: وشاورھم فی الامر۔ واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ والامر الیک۔

اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورے کا حکم اس پس منظر میں دیا گیا کہ آنحضرتؐ بعض صحابہ کے طرزِ عمل سے خوش نہ تھے۔ اور اُن سے مشورہ لینے میں بظاہر انقباض محسوس کرتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے نبیؐ کی رحمت اور نرم خوئی کو اُن صحابہؓ کے لیے شفیع بنایا۔ اور اُن کو معاف کر دینے کی ہدایت اس بلیغ انداز میں کی کہ اے نبی نہ صرف تم اُنہیں معاف کر دو بلکہ اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت کے لیے دعا بھی کیا کرو۔ لیکن ساری ناراضگی کے باوجود ان سے مشورہ ضرور لو۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اکثر و بیشتر مسائل میں صحابہؓ سے مشورہ فرماتے تھے۔ اور اکثریت کے احترام کی عملی نظیریں بھی قائم کرتے تھے — لیکن اس آیت کے سلسلہ میں بعض حضرات نے اس عجیب خیال کا اظہار کیا ہے کہ آنحضرتؐ کو مشورہ لینے کا حکم محض صحابہ کرام کی دلجوئی کے لیے تھا، ورنہ آپ کے لیے اُن کے مشوروں پر عمل کرنا ضروری نہ تھا۔ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ آپ کو یہ حکم محض اُمت کی تعلیم کی خاطر دیا گیا، لیکن یہ دونوں خیال قطعاً غلط ہیں۔

قاضی ابوبکر الجصاصؒ نے ان دونوں خیالات پر سختی سے گرفت کرتے ہوئے لکھا ہے:

وغیر جائز ان یکون الامر بالمشاورۃ علی جھۃ تطییب نفوسھم ورفع اقدارھم ولیقتدی الامۃ بہ فی مثلہ لانہ لو کان معلوماً عندھم انھم استفرغوا مجھودھم فی استنباط ما شوروا فیہ وصواب الرأی فیما سئلوا عنہ ثم لم یکن ذالک معمولاً علیہ ولا متلقی منہ بالقبول بوجہ لم یکن فی ذالک تطییب نفوسھم ولا رفع لاقدارھم بل فیہ ایحاشھم واعلامھم بان آراءھم غیر مقبولۃ ولا معمولا علیھا فھذا تاویل ساقط لا معنی لھا فکیف یسوغ تاویل من تاولہ "لیقتدی بہ الامۃ"	اور یہ بات درست نہیں ہو سکتی کہ مشورہ کا حکم محض، ان کے دل خوش کرنے یا اُن کا مرتبہ بلند کرنے کے لیے دیا گیا ہو۔ یا اس لیے ہو کہ امت اس جیسے معاملات میں اس عمل کی تقلید کرے۔ اس لیے کہ اگر اُن کو یہ بات معلوم ہو کہ مشورہ طلب مسئلہ کے حل کرنے اور صحیح رائے معلوم کرنے میں خواہ وہ اپنی پوری کوشش صرف کر دیں پھر بھی اس پر نہ عمل ہو گا اور نہ اُسے کسی طرح سے قبولیت کا شرف حاصل ہو گا، تو اس صورت میں اُن کا دل خوش تو کیا ہو گا اور ان کے مرتبہ کی بلندی تو کیا ظاہر ہو گی البتہ اس سے وہ اور زیادہ بددل ہوں گے اور اس طرح اُن کو گویا یہ تبلا دیا جائے گا کہ ان کی آراء نہ قبول کی جائیں گی اور نہ اُن پر عمل کیا جائیگا۔ اس لیے قرآن کی آیت کی یہ توجیہ بالکل ناقابلِ التفات

مع علم الامة عند هٰذا القائل بان هٰذه المشورة لم تفد شيئاً ولم يعمل بشيء اشاروا به۔

(احکام القرآن تفسیر آیت وشاورهم فی الامر)

ہے۔ اور نہ اس کا کوئی مفہوم ہے۔ اور اسی طرح اُمّت کی "تقلید" کو مقصود بتانے والوں کی رائے بھی کیسے درست ہو سکتی ہے، کیونکہ اُن حضرات کے قول کے مطابق اُمّت جانتی ہوگی کہ اس مشورہ کا کوئی فائدہ تو تھا ہی نہیں۔ اور نہ صحابہ نے کسی مشورہ پر عمل کیا گیا۔

اس سلسلہ میں ایک عجیب تر بات یہ کہی جاتی ہے کہ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ کا مطلب یہ ہے کہ مشورہ کرنے کے بعد جب تم اہلِ شوریٰ کے مشورہ کے خلاف کوئی فیصلہ کر لو تو اہلِ شوریٰ کی پروا نہ کرو اور خدا کے بھروسہ پر اپنے فیصلہ پر عمل کر ڈالو۔

حالانکہ اس آیت کا سیدھا سادھا مفہوم یہ ہے کہ مشورہ کے نتیجہ میں جو فیصلہ ہو جائے اُسے اللہ کی تائید حاصل ہوگی اور اللہ کے بھروسہ پر اُس پر عمل درآمد کر ڈالنا چاہیے۔ چنانچہ اس آیت کی یہی تفسیر مفسّرین نے کی ہے۔ اور بعض اصحاب سے یہی تفسیر مرفوعاً منقول ہے۔

مشہور مفسّر ابن کثیر لکھتے ہیں:

ای اذا شاورتهم فی الامر وعزمت علیه فتوکل علی الله فیه۔

یعنی جب تم (اے نبیؐ) اُن سے حکومت کے بارے میں مشورہ کر لو اور کوئی فیصلہ کر کے اس کا عزم کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔

ابنِ کثیرؒ نے اسی سلسلہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ایک مرفوع حدیث بھی نقل کی ہے:

عن علی ابن ابی طالب قال سئل رسول الله صلی الله علیه وسلم عن العزم قال مشاورة اهل الرأی ثم اتباعهم

حضرت علیؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ نبیؐ سے "عزم" کے معنی دریافت کیے گئے تو آپ نے فرمایا "اہل الرائے سے مشورہ کرنا اور پھر اس کا اتباع کرنا۔"

پھر اس سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بالکل واضح ہے۔ آپ نے جس مسئلہ میں بھی صحابہ کرام سے مشورہ طلب کیا اس میں ہمیشہ اکثریت کے فیصلہ پر عمل کیا ہے۔ خواہ وہ فیصلہ آپ کو پسند ہو یا نہ ہو بلکہ آنحضرتؐ نے اس سے بڑھ کر اپنے اس طے شدہ فیصلہ کا اعلان فرمایا ہے کہ "شیخینؓ" بھی اگر کسی مسئلہ میں ایک متفقہ رائے دیں گے تو اُن کی رائے کے خلاف حضورؐ کوئی کام نہ کریں گے۔

عن عبد الرحمٰن ابن غنم انّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم قال لابی بکر و عمر لو اجتمعتما فی مشورۃ ما خالفتکما۔ (احمد بحوالہ ابن کثیر)

عبدالرحمٰن ابن غنم سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ "اگر تم کسی مشورہ پر متفق ہو جاؤ تو میں تمہارے مشورہ کے خلاف عمل نہ کروں گا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم مشورہ طلب امور میں ہمیشہ اکثریت کی رائے کی کس طرح پیروی کی ہے، اس کی صرف چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔ غزوۂ اُحد کے موقعہ پر حضورؐ نے صحابہؓ سے مشورہ طلب کیا کہ دشمن کا مقابلہ کس طرح کیا جائے، مدینہ میں رہ کر ہی جنگ لڑی جائے یا باہر نکل کر؟ اس مشورہ کی تفصیل ابنِ ہشام نے یوں نقل کی ہے۔

فان رأیتم ان تقیموا بالمدینۃ وتدعوھم حیث نزلوا فان اقاموا اقاموا ابشر مقام وان ھم دخلوا علینا قاتلناھم فیھا۔

تو اگر تمہاری رائے ہو تو ایسا کر لو کہ مدینہ میں قیام کرو اور ان (کفار) کو جہاں وہ اُترے ہیں وہیں چھوڑ دو۔ پھر اگر وہ وہاں قیام کریں گے تو نہایت بُری جگہ قیام ہوگا۔ اور اگر وہ ہمارے پاس آ گئے تو ہم مدینہ ہی میں اُن کا مقابلہ کریں گے۔

لیکن بدر کی لڑائی میں شرکت سے محروم رہ جانے والے نوجوانوں کی اکثریت باہر نکل کر مقابلہ کرنے پر اصرار کرتی رہی۔ یہاں تک کہ حضورؐ گھر میں داخل ہوئے اور اسلحہ سے لیس ہو کر باہر تشریف لائے۔ ابن ہشام نے آگے مزید تفصیل سے یہ بات واضح کی کہ حضورؐ کو اکثریت کا یہ فیصلہ پسند نہ تھا لیکن پھر بھی آپ نے اس پر عمل کرنا ضروری سمجھا۔

وقد ندم الناس وقالوا استکرھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولم یکن لنا ذالک فلما خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قالوا یا رسول اللہ استکرھناک ولم یکن ذالک لنا فان شئت فاقعد فقال صلی اللہ علیہ وسلم ما ینبغی لنبی اذا لبس

لوگ شرمندہ ہو چکے تھے اور انہوں نے (آپس میں) کہا کہ ہم نے رسولؐ کو مجبور کیا حالانکہ ہمارا حق نہ تھا۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو انہوں نے کہا "یا رسول اللہ ہم نے آپ کو مجبور کیا حالانکہ اس بات کا ہم کو حق نہ تھا۔ اس لیے اگر آپ کی مرضی ہو تو مدینہ میں ہی ٹھہر جائیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب

لامۃ ان یضعھا حتی یقاتل ۔ | دیا۔کسی نبی کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ ہتھیار اُٹھا لینے کے بعد جنگ کرنے سے پہلے ہتھیار واپس رکھ دے

یہ ہے فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ کی عملی تفسیر۔یعنی مشورہ کے بعد جو طے ہو گیا اُس پر عمل ہونا چاہیے۔گھڑی گھڑی فیصلہ تبدیل کرنا اپنی بربادی کو دعوت دینا ہے۔

بعض حضرات نے غزوۂ اُحد کے اس واقعہ کی یہ توجیہ کی ہے کہ حضورؐ نے اپنی رائے تبدیل کر کے اکثریت کی رائے سے اتفاق کر لیا تھا،اس لیے یہ اکثریت کا فیصلہ نہیں بلکہ خود حضورؐ کا اپنا فیصلہ تھا حالانکہ ابن ہشامؒ اور دوسرے مؤرخین نے جس طرح اس واقعہ کو نقل کیا ہے اس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اکثریت کی رائے کا لحاظ کرتے ہوئے آپؐ نے یہ فیصلہ قبول کیا تھا۔حالانکہ آپ خود دل سے اس پر راضی نہ تھے۔اس لیے جب لوگوں کو حضورؐ کی ناراضگی کا احساس ہوا تو انہوں نے اپنے اصرار پر اظہارِ ندامت کرتے ہوئے اپنی رائے واپس لینے کا خیال ظاہر کیا تو حضورؐ نے جواباً یہ نہیں فرمایا کہ میں اس فیصلہ سے ناراض نہیں ہوں اور یہ کہ میں نے خود اپنی رائے بدل ڈالی ہے بلکہ آپ نے صرف بار بار فیصلہ بدلنے سے معذوری ظاہر کی۔

اسی طرح غزوۂ احزاب (خندق) کے موقع پر آپؐ نے بعض حملہ آور قبائل سے عارضی مصالحت کا ارادہ کیا تاکہ اس طرح کفار کا زور توڑا جا سکے۔ابتدائی گفتگو بھی ہو گئی۔اور آنحضرتؐ نے مدینہ کی پیداوار کا ایک حصہ دینا بھی قبول فرما لیا۔لیکن آخری فیصلہ سے قبل آپ نے انصار کے اہل الرائے سے مشورہ کرنا ضروری خیال کیا۔ابن ہشام نے اس واقعہ کی تفصیل اس طرح نقل کی ہے۔

فلما اراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یفعل بعث الی سعد ابن معاذ وسعد بن عبادۃ فذکر ذالک لھما فقالا لہ یا رسول اللہ امرًا تحبہ فنصنعہ ام شیئًا امرک اللہ بہ لابدلنا من العمل بہ ام تصنعہ لنا قال بل شیئًا اصنعہ لکم، فقال سعد بن معاذ واللہ مالنا بھذا من حاجۃ۔فقال	چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح کی تکمیل کا ارادہ فرمالیا۔تو اوس کے سردار سعد بن معاذ اور خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو آپ نے طلب فرمایا اور ان سے معاملہ کا ذکر کیا۔تو ان دونوں اصحاب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا (یا رسول اللہ) آپ نے یہ تجویز خود پسند فرمائی ہے کہ ہم اس پر عمل کریں یا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ ہم اس کی لازمی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فانت و ذاک۔ | تعمیل کریں۔ یا آپ نے محض ہمارے فائدہ کے لیے یہ قدم اٹھانے کا فیصلہ فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے یہ کام تمہارے فائدہ ہی کو ملحوظ رکھ کر کیا ہے

توسعد بن معاذ نے کہا، خدا کی قسم ہم کو اس کی ضرورت نہیں: ... یہ پُرعزم جواب سُن کر رسولؐ نے فرمایا اچھا! تو جو تمہاری مرضی۔

شورائیت کو فروغ دینے کے لیے اسلام نے تحریر و تقریر کی مکمل آزادی عطا کی ہے۔ بلکہ غلط باتوں پر ٹوکنا اور اُن سے روکنا ہر مومن پر واجب قرار دیا ہے۔ اور ظالم اور جابر حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق کہنے کو افضل ترین جہاد قرار دیا ہے۔ تنقید اور محاسبہ کے اس حق کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اور خلفائے راشدین نے نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی اور سخت سے سخت الفاظ میں گرفت کرنے والوں کو نرمی اور حلم کے ساتھ جوابات دیکر مطمئن کیا۔ جنگ ہوازن کے مالِ غنیمت کی تقسیم کے بارے میں بعض پُرجوش انصار نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اپنوں کا خیال کیا ہے اور ہم کو محروم رکھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس الزام کی حقیقت انصار کے جلسۂ عام میں واضح کی۔ اور مالِ غنیمت کی تقسیم کی حکمت بیان کر کے تمام انصار کو مطمئن فرمایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کرنے والے ایک شاعر کے بارے میں کسی نے مشورہ دیا کہ اس کی زبان کاٹ لی جائے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مشورہ کو رد کیا۔ کسی شخص نے حضرت عمرؓ کو نہایت سختی سے کہا "اِتَّقِ اللہ یا عمر!" اے عمرؓ اللہ سے ڈر! حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس شخص کو ایسے سخت الفاظ کہنے سے منع کیا تو حضرت عمرؓ نے کہا "اسے کہنے دو اگر یہ لوگ ہم کو نہ ٹوکیں تو ان میں کوئی بھلائی نہیں۔ اور اگر ہم ان کی بات نہ سنیں تو ہمارے اندر کوئی خوبی نہیں۔

بعض حضرات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ عمل کو جو آپ نے حدیبیہ میں اختیار فرمایا تھا امیر کے حقِ استبداد کے سلسلہ میں قاطع دلیل کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ اس واقعہ میں اس کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ میں سربراہِ مملکت اور درج کے سپریم کمانڈر کی حیثیت سے تشریف رکھتے تھے۔ جنگی حالات میں بالعموم اور بالخصوص میدانِ جنگ میں سربراہ مملکت کو صلح و جنگ کے وسیع اختیارات ہوتے ہیں۔ اور عین میدانِ جنگ میں شوریٰ کی پابندی کرنا ضروری نہیں ہوتا۔

کیونکہ اقدامات کی حکمت کو اگر قبل از وقت واضح کر دیا جائے تو اُن اقدامات کی افادیت ختم ہو جاتی ہے
صلح حُدیبیہ کی صورتِ حال یہی تھی۔ مدینہ منورہ خیبر کے یہود اور مکہ کے قریش دونوں کی زد میں
تھا۔ خیبر اور مکہ دونوں سے مدینہ منورہ تقریباً تین سو میل کے فاصلہ پر ہے۔ اگر ایک دشمن کے خلاف
مسلمان لشکر کشی کرتے تو اندیشہ تھا کہ دوسرا دشمن پیچھے سے آکر اسلامی سلطنت کے پایہ تخت کو روند
ڈالے اس لیے ناگزیر تھا کہ دونوں دشمنوں میں سے ایک دشمن سے وقتی طور پر کسی نہ کسی قسم کا معاہدہ
ہو جاتے۔ یہود سے یہ معاہدہ کسی طرح ممکن نہ تھا اس لیے آپ اشہرِ حُرم میں عمرہ کی نیت سے بغیر ہتھیار
مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوتے۔ خیال یہ تھا کہ کفار اپنی جھوٹی عزت کی خاطر عمرے سے روکیں گے
اور آئندہ اپنی مرضی سے آنے دینے کا بہانہ بنائیں گے۔ اس طرح ان سے معاہدہ ہو جائے گا اور ایک
طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد یہود کو ختم کرنا آسان ہو جائے گا اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے
ابتدا ہی میں اعلان فرما دیا کہ حرم کی عزت کو برقرار رکھنے کیلیے کفار جن شرائط پر بھی معاہدہ کرنا چاہیں گے
میں ان شرائط کو تسلیم کر لوں گا۔

یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حُدیبیہ کے معاہدہ میں کفار کی ہر شرط کو منظور کر کے دس
سال تک جنگ بندی کا اطمینان حاصل کر لیا اور جوں ہی یہ معاہدہ مکمل ہوا آپ نے فوراً خیبر کا رُخ کیا
کہ کہیں دشمنوں کو اپنی سیاسی غلطی کا احساس نہ ہو جائے اور وہ اس معاہدے کو منسوخ نہ کر دیں۔

اب اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چند آدمیوں کو اس حکمت سے پہلے ہی باخبر کر دیتے تو اوّل تو یہ
پورے لشکر کی بے اطمینانی کا علاج نہ تھا اور دوسرے اس حکمت کے افشاء ہونے کا بھی خطرہ تھا اس
صورت میں ممکن ہے دشمن عمرے کی اجازت دے دیتا اور جنگ بندی نہ قبول کرتا۔

ظاہر ہے کہ ایسے جنگی حالات میں سربراہ اپنی صوابدید سے جوابدہی کا خطرہ مول لے کر اقدامات
کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حُدیبیہ کی صلح کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے قطعاً مشورہ نہ لیا،
اس لیے یہ بات کہنا سرے سے غلط ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شوریٰ یا عام مسلمانوں کی اکثریت
کی رائے کے خلاف کیا۔ عین ممکن ہے کہ اس نازک مرحلے پر آنحضورؐ کی رہنمائی بذریعہ وحی بھی فرمائی گئی ہو۔
آپ کے ان خالص تنفیذی اور انتظامی اقدامات پر بعض حضرات نے اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا

تو آپ نے ان کو مبہم سا جواب دے کر اپنے اختیارات کی طرف توجہ دلائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سب سے زیادہ مضطرب تھے اور انہی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرنے کی ہمت بھی کر ڈالی۔ چنانچہ ابنِ ہشام نے نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا:

فعلام نعطی الدنیۃ فی دیننا قال انا عبداللہ ورسولہ لن اخالف امرہ ولن یضیعنی . . . فکان عمر یقول ما زلت اتصدق واصوم واصلی واعتق من الذی صنعت یومئذ۔

(ابنِ ہشام)

تو ہم اپنے دین میں دب کر بات کیوں قبول کریں۔ آپؐ نے جواب دیا: میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، میں اس کے حکم کی خلاف ورزی نہ کروں گا، اور وہ مجھے کبھی برباد نہ ہونے دیگا۔ حضرت عمرؓ کہا کرتے تھے کہ میں نے حضورؐ سے اُس دن جس طرح گفتگو کی اس کی وجہ سے میں صدقات، روزوں، نمازوں اور غلاموں کو آزاد کرنے کے ذریعے مستقل کفارہ ادا کرتا رہا ہوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اجمالی جواب میں یہ بات واضح کر دی کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، اس کی نافرمانی نہیں کروں گا اور سربراہ مملکت کی اطاعت سے نکلنے کی اجازت اسی وقت ہوتی ہے جب وہ معصیت کا حکم کرے اور آپ نے مزید فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ذمہ داری میں میری رہنمائی کرے گا اور مجھے کوئی ایسا قدم نہ اٹھانے دے گا جس میں میری بربادی ہو۔

جس وقت معاہدۂ صلح لکھا جا رہا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سربراہ کی حیثیت سے معاہدہ املا کرا رہے تھے اس وقت کفار کے نمائندے نے بعض لفظی بحثیں چھیڑ دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی ہر کٹ حجتی سے درگذر کر کے تکمیلِ معاہدہ کی جانب متوجہ رہے۔ اس حالت میں بعض حاضرین نے کفار کے نمائندے کے مطالبے پر بعض الفاظ میں ردّ و بدل پر اپنے عدمِ اطمینان کا اظہار کیا۔ افسوس ہے کہ اس واقعہ کو بھی بعض لوگوں نے حقِ استرداد ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا ہے حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دورِ حاضر کی نام نہاد "عوامی جمہوریت" کے قائل نہ تھے۔ ظاہر ہے کہ معاہدہ کا متن کوئی ذمہ دار فرد تحریر کرتا ہے۔ جلسۂ عام اس قسم کا متن تیار کرنے کا مجاز کب ہوتا ہے کہ حضورؐ ان اصحاب کی رائے کے پابند ہوتے جو معاہدہ کا متن تیار کرنے کے سلسلہ میں مشورے دے رہے تھے۔

اسی طرح مانعینِ زکوٰۃ کے سلسلہ میں حضرت ابوبکرؓ کے اقدام کو بھی بعض لوگ امیر کا حق استرداد

ثابت کرنے کے لیے آخری دلیل تصور کرتے ہیں حالانکہ اس سے زیادہ کمزور اور بودا استدلال ممکن ہی نہیں ہے۔

صورتِ مسئلہ یہ ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سربراہِ مملکت کی حیثیت سے مملکت کے اختیارِ حکمرانی اور نظامِ دین کے تحفظ کے ذمہ دار تھے۔ یہ بات سرے سے مشورہ طلب نہیں تھی اور نہ کبھی مشورہ طلب ہو سکتی ہے کہ ایک سربراہ اہلِ شوریٰ سے اس باب میں مشورہ کرے کہ اسے قانون کا تحفظ کرنا چاہیے یا نہیں یا اگر کوئی طاقت مملکت کی حاکمیت SOVEREIGNTY کو چیلنج کرے تو اس کا مقابلہ کرنا چاہیے یا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف اقدام کرنے کے بارے میں شوریٰ کو بلا کر اس سے مشورہ لینے کی ضرورت محسوس ہی نہ کی بلکہ مانعینِ زکوٰۃ نے خود اپنے وفود بھیج کر بعض صحابہؓ کو حضرت ابوبکرؓ سے گفتگو پر آمادہ کیا چنانچہ حضرت عمرؓ اور چند بدری صحابہؓ حضرت ابوبکرؓ کے پاس خود چل کر گئے اور ان سے گفتگو کی۔ حضرت حسن بصری کے حوالے سے قاضی ابوبکر الجصاص نے یہ گفتگو اس طرح نقل کی ہے:

قالوا دعهم فانهم اذا استقر الاسلام فی قلوبهم و ثبت، ادّوا فقال واللہ لو منعونی عقالاً[1] مما اخذ رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلّم لقاتلتهم علیه وقاتل رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلّم علی ثلاث شهادة لا اله الا اللہ واقام الصلوٰة وایتاء الزکوٰة وقال اللہ تعالیٰ "فان تابوا واقاموا الصلوٰة وآتوا الزکوٰة فخلوا سبیلهم" واللہ لااسئل فوقهن ولا اقصر دونهم۔ فقالوا له یا ابا بکر نحن نزکی ولا نؤدیها الیك فقال لا واللہ حتی آخذها کما اخذها رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم۔

انہوں نے کہا ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیجیے جب ان کے دلوں میں اسلام پختہ ہو جائے گا تو یہ خود زکوٰۃ ادا کریں گے تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا خدا کی قسم اگر انہوں نے اس زکوٰۃ کی ایک قسط بھی روکی جو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو ادا کرتے تھے تو میں ان سے لڑوں گا اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے تین چیزوں کے لیے جنگ کی ہے یعنی لا الٰہ الا اللہ کی شہادت، نماز کی اقامت اور زکوٰۃ کی ادائیگی نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اگر وہ (منکر) توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کو چھوڑ دو۔ خدا کی قسم میں نہ اس سے کچھ زیادہ کا مطالبہ کرتا ہوں اور نہ اس سے کچھ کم پر راضی ہوں۔ تو انہوں نے کہا کہ ابوبکرؓ! ہم زکوٰۃ تو نکالیں گے

[1] عقال اونٹ باندھنے کی رسی کے معنی میں لیا گیا ہے لیکن تحقیق یہ ہے کہ عقال از زکوٰۃ کی مد میں ایک بار جتنے جانور دیئے جائیں ان کے مجموعے کو کہتے ہیں۔

(احکام القرآن) لیکن تم کو نہ دیں گے۔ تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا نہیں! خدا کی قسم (میں راضی نہ ہونگا) جب تک میں اسی طرح زکوٰۃ وصول نہ کر لوں جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم وصول فرماتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی یہ گفتگو صحیحین اور نسائی وغیرہ کتب احادیث میں نقل ہوئی ہے اس کی تفصیل جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا استدلال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے تھا کہ

امرت اَن اقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰہ الا اللہ فمن قال لا الٰہ الا اللہ فقد عصم منی نفسہ ومالہ الا بحقہ وحسابہ علیَ اللہ ۔

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے (عرب کے لوگوں سے جن پر اتمامِ حجت ہو چکا تھا) جنگ کرونگا یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کہیں تو جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا اس نے اپنے جان و مال کو مجھ سے بچا لیا۔ سوائے اس کے کہ لا الٰہ الا اللہ اس کا تقاضا کرے اور اس کے (باطن کا) حساب اللہ پر ہے۔

لیکن حضرت ابوبکرؓ نے جب وہ حدیث بیان کی جس کا پہلے ذکر آچکا ہے اور قرآن کی مذکورہ آیت سے استدلال کیا تو حضرت عمرؓ نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا۔ علامہ عینیؒ نے بخاری کی شرح میں لکھا ہے کہ غالباً حضرت عمرؓ کو وہ حدیث اس سے قبل نہ پہنچی تھی جس میں زکوٰۃ ادا کرنے کو بھی تحفظِ جان و مال کا حق حاصل کرنے کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے۔

پھر حضرت ابوبکرؓ نے بھی حضرت عمرؓ ہی کی حدیث میں "الا بحقہ" سے استدلال کرکے ان کو بتایا کہ اس حدیث میں جو اجمال ہے اس کی تشریح دوسری حدیث کرتی ہے کہ حق سے مراد نماز اور ادائے زکوٰۃ ہے حضرت ابوبکرؓ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

الیس قد قال اللہ بحقہ ومن حقہ الصلاۃ والزکوٰۃ ۔

کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے الا بحقہ نہیں کہا ہے؟ نماز اور زکوٰۃ اس کے حق میں داخل ہیں

اس مسئلہ میں حضرت ابوبکرؓ کے جذبات نہایت شدید تھے۔ امام نسائیؒ نے حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کی گفتگو اس طرح نقل کی ہے۔

قال عمر یا خلیفۃ رسول اللہ تألف الناس وارفق بھم فقال رجوت نصرتک وجئتنی بخذلانک اجبار فی الجاھلیۃ وخوار فی الاسلام !! انہ قد انقطع الوحی وتم الدین او ینقص وانا حیٌّ !!!	حضرت عمرؓ نے کہا کہ اے خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی تالیفِ قلب کیجیے اور ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیجیے تو حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا مجھے تم سے مدد کی توقع تھی اور تم میرا ساتھ چھوڑنے کی اطلاع لے کر آئے ہو۔ جاہلیت میں تو بڑے بہادر تھے۔ اسلام میں آکر بزدل بن گئے ہو۔ دیکھو وحی کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے اور دین مکمل ہو گیا ہے۔ تو کیا میرے جیتے جی اس میں کمی کی جا سکتی ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کے ان ایمان افروز جذبات اور اس مضبوط استدلال کو سن کر حضرت عمرؓ نے اپنی رائے تبدیل کر دی۔ چنانچہ بخاری اور دیگر کتب صحاح میں ہے۔

قال عمر فواللہ ما ھو الا ان رأیت ان قد شرح اللہ صدر ابی بکر للقتال فعرفت انہ الحق۔	حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ بالآخر نتیجہ یہ ہوا کہ میں سمجھ گیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکرؓ کو جنگ کرنے کے لیے یکسو کر دیا ہے تو میں نے سمجھ لیا کہ یہی فیصلہ حق ہے۔

اس بارے میں قاضی ابوبکر الجصاص نے نہایت فیصلہ کن تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

ھذا الذی فعلہ ابوبکرؓ فی مانعی الزکوٰۃ بموافقۃ الصحابۃ ایاہ من غیر خلاف منھم بعد ما تبینوا صحۃ رأیہ۔	حضرت ابوبکرؓ نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف جو قدم اٹھایا وہ صحابہ کی مکمل تائید اور ان کی ادنیٰ مخالفت کے بغیر اٹھایا کیونکہ انہوں نے آپ کی رائے کی صحت کو تسلیم کر کے آپ کی مکمل تائید کی تھی۔

مذکورہ بالا سطور سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ امیر اور خلیفہ اہلِ شوریٰ کی رائے کا پابند ہے۔ اسے اپنے تمام فیصلے شوریٰ کے مشورے سے کرنے چاہییں البتہ انتظامی امور اور تنفیذ قانون کے سلسلہ میں امیر جو اقدام کرے اس کے لیے پیشگی مشورہ لینا ضروری نہیں۔ وہ بامید منظوری ایسے اقدام کر سکتا ہے لیکن وہ اپنے تمام اقدامات کے لیے اہلِ شوریٰ بلکہ عامۃ المسلمین تک کے سامنے جوابدہ ہے۔

رسائل و مسائل

جماعت اسلامی اور جمہوریت ——— تسخیر کا مفہوم

سوال۔ ذہن میں دو سوالات ہیں جن کے صحیح اور تسلی بخش جوابات کے لیے آپ کی طرف رجوع کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ جلد جوابات سے ممنون فرمائیں گے

۱۔ جماعت اسلامی اس ملک میں عرصہ سے جمہوریت کی بحالی کے لیے جدوجہد کر رہی ہے۔ کیونکہ وہ جمہوریت کو اسلامی نظام کے قیام و نفاذ کے لیے ایک ذریعہ سمجھتی ہے مگر موجودہ انتخابات میں جبکہ ملک کے جمہور نے خلاف اسلام قوتوں کے حق میں اپنی رائے استعمال کی ہے تو کیا اس کے بعد بھی جمہور کو اسلامیت کا شعور بخشے بغیر یا جمہور کا اسلامیت کے شعور سے بہرہ مند ہوئے بغیر اُن کی موجودہ ذہنی و اخلاقی سطح کے ساتھ جمہوریت اسلامی نظام کے قیام کے لیے ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے؟ اگر ہو سکتی ہے تو کیسے؟ اگر نہیں تو جماعت اسلامی کا اب جمہوریت کے بارے میں کیا رویہ ہے؟

۲۔ اسلام اور موجودہ سائنسی نقطۂ نظر سے "تسخیر" کا مفہوم کیا ہے اور دورِ جدید کے سائنسی کمالات و اکتشافات پر تسخیر کا اطلاق کیا صحیح ہے؟ بالخصوص چاند پر انسان کی رسائی کے لیے تسخیر چاند کی اصطلاح استعمال کرنا کہاں تک درست ہے؟

جواب۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کے سوالات کے جوابات دینے میں کافی تاخیر ہو گئی ہے۔

گزشتہ انتخابات میں جماعت اسلامی کے ناکام ہونے کے باوجود جمہوریت کے بارے میں اس کے موقف میں بحمداللہ کوئی تبدیلی نہیں آئی اور وہ اب بھی اپنے اس موقف پر علیٰ حالہٖ قائم ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی نظام کے قیام کے لیے جمہوری راستوں کو چھوڑ کر آمریت کی راہ اختیار نہیں کرنی چاہیے کیونکہ یہ راہ اگرچہ بظاہر بڑی آسان اور مختصر معلوم ہوتی ہے مگر خطرات سے پُر ہے اور بعض اوقات انقلاب کا یہ راستہ کسی قوم کو بہت بڑی تباہی سے دوچار کر دیتا ہے۔ آپ نے اپنے خط میں استدلال کی جو عمارت کھڑی کی ہے اُس سے یہ معلوم

ہوتا ہے کہ آپ عوام کو "اسلامیت کے شعور" سے بہرہ مند کیے بغیر انتخابات میں حصہ لینا جماعت اسلامی کی قوتوں کا زیاں سمجھتے ہیں، مگر شاید آپ اس حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہیں کہ انتخابات میں جماعت اسلامی کی شرکت عوام کے اسلامی شعور کو بیدار کرنے کا بھی تو ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انتخابات کے نتائج ہماری خواہش اور توقع کے مطابق برآمد نہیں ہوئے مگر ان انتخابات کے دوران جماعت اسلامی سے دلچسپی رکھنے والے افراد نے جو جد و جہد کی ہے کیا وہ ذہنوں کو بیدار کرنے میں بالکل رائگاں ثابت ہوئی ہے؟

۲۔ عربی لغت اور اسلامی اصطلاح کی رُو سے تسخیر کے معنی کسی کو کسی خاص مقصد کی طرف زبردستی لے جانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ۔ "اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اس نے (اپنے کرم سے) ان سب کو تمہارے کام پر لگا دیا ہے۔" وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ۔ "جس نے سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کیا کہ لگاتار چلے جا رہے ہیں اور رات اور دن کو تمہارے لیے مسخر کیا۔"

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اسی آیت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

"تمہارے لیے مسخر کیا" کو عام طور پر لوگ غلطی سے "تمہارے تابع کر دیا" کے معنی میں لے لیتے ہیں اور پھر اس مضمون کی آیات سے عجیب عجیب معنی پیدا کرنے لگتے ہیں حتیٰ کہ بعض لوگ تو یہاں تک سمجھ بیٹھے کہ ان آیات کی رُو سے تسخیر السموات والارض انسان کا منتہائے مقصود ہے حالانکہ انسان کے لیے ان چیزوں کو مسخر کرنے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے قوانین کا پابند بنا رکھا ہے جن کی بدولت وہ انسان کے لیے نافع ہو گئی ہیں۔ کشتی اگر فطرت کے چند مخصوص قوانین کی پابند نہ ہوتی تو انسان کبھی بحری سفر نہ کر سکتا۔ دریا اگر مخصوص قوانین میں جکڑے ہوئے نہ ہوتے تو کبھی ان سے نہریں نہ نکالی جا سکتیں۔ سورج اور چاند اور روز و شب اگر ضابطوں میں کسے ہوئے نہ ہوتے تو یہاں انسانی زندگی ہی ممکن نہ ہوتی، کجا کہ ایک پھلتا پھولتا انسانی تمدن وجود میں آ سکتا۔"

قرآن حکیم میں کائنات کی مختلف اشیاء کے بارے میں تسخیر کا جو لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس کے موقع اور محل کو دیکھتے ہوئے دورِ جدید کے سائنسی کمالات و اکتشافات پر تسخیر کا اطلاق کسی طرح بھی صحیح معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ تسخیر کا عمل تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ انسان کائنات کے مختلف مخفی گوشوں کی تلاش کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ

مطبوعات

تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ | مرتبہ جناب محمد ایوب قادری. شائع کردہ مکتبہ معاویہ لیاقت آباد کراچی صفحات ۱۵۲ - قیمت ۳ روپے - طباعت کتابت عمدہ -

تبلیغی جماعت نے عوام کے اندر دینی جذبہ پیدا کرنے اور ان کے عقیدہ و ایمان کی درستی کے لیے جو کام کیا ہے، اُس کے طریق کار سے تو اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

زیر نظر کتاب میں ملک کے معروف مصنف نے برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے وقت اور بعد کے ادوار میں اشاعت اسلام کا جو کام ہوا اس کا مختصر جائزہ پیش کیا ہے اور قریبی زمانہ میں عیسائیت اور آریہ سماج کی تحریکوں کے رد میں علمائے اسلام کی مساعی پر بھی روشنی ڈالی ہے - آخر میں ذرا تفصیل سے میوات میں تبلیغی جماعت کے ابتدائی کام اور مولانا محمد الیاسؒ اور مولانا محمد یوسفؒ کی ہند و پاک اور بیرون ملک میں تبلیغی خدمات کو پیش کیا ہے۔

خدمت دین بجا لانے والوں کے کام کا تاریخی جائزہ اس لحاظ سے نہایت مفید کاوش ہے کہ بعد میں آنے والے اس سے جذبہ اور رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

(بقیہ: رسائل و مسائل)

نے عالم طبیعیات میں جو مختلف قوتیں پیدا کر رکھی ہیں اُن سے استفادہ کرنے کے لیے تجربات کرتا رہتا ہے لہٰذا یہ تسخیر نہیں بلکہ محض اکتشاف (DISCOVERY) یا دریافت (EXPLORATION) ہے - جس ذات باری نے کائنات کی تخلیق کی ہے. اسی ذات نے اپنے قوانین سے اس کی تسخیر بھی کر رکھی ہے تاکہ ہم اس کی گوناگوں نعمتوں سے استفادہ کر سکیں۔

سرچشمۂ حیات و کلید عظمی، مصنف ... نظامی، ناشر ... نظامی ... [illegible]

[illegible]

اور قرب و محبت کے سلسلہ میں صوفیاء کے اقوال مناسب تشریح کے ساتھ درج ہیں۔ آخر میں متصوفین کے مخصوص کلمات و اشارات کی وضاحت اور ان کے عجیب و غریب احوال کا ذکر ملتا ہے جو بظاہر ناممکن اور محال نظر آتے ہیں۔

کتب تصوف کی اشاعت اس لحاظ سے ایک مستحسن کام ہے کہ ان کا مطالعہ انسان کو صفاتِ حسنہ سے متصف ہونے میں مدد دیتا ہے۔ . . . اڑھائی سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت ۵ روپے زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

مسلمان قومیں | تالیف: جناب آباد شاہ پوری صاحب۔ ناشر: ایوانِ ادب، چوک اردو بازار لاہور قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۲ روپے سستا ایڈیشن ایک روپیہ ۲۵ پیسے۔

اس معلومات افزا اور فکر انگیز کتاب کے مصنف جناب آباد شاہ پوری صاحب علمی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علم نافع کے ساتھ سلامتی فکر اور دل بیدار بھی عطا کیا ہے، اس لیے ان کی تحریریں اپنے دامن میں نہ صرف بیش قیمت معلومات کا ذخیرہ سمیٹے ہوئے ہوتی ہیں بلکہ خلوص اور دلسوزی کے ساتھ حالات کا نہایت اچھا تجزیہ بھی پیش کرتی ہیں۔ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں فاضل مصنف نے روسی سامراج کے ظلم و استبداد کی شکار مسلم ریاستوں کی المناک داستان بیان کی ہے۔ دوسرے حصے میں چینی مسلمانوں پر چینی سامراج کی "کرم فرمائیوں" کا تذکرہ درج ہے۔ تیسرے حصے میں فاضل مصنف نے "پس چہ باید کرد" کے عنوان کے تحت مسلمانوں کو "سرخ سویرے" کے خطرات سے آگاہ کیا ہے۔ ہم اس کتاب کے مطالعہ کی پُرزور سفارش کرتے ہیں۔

کتاب کا معیارِ طباعت و کتابت عمدہ ہے۔

مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے | تالیف: مولوی نور احمد صاحب۔ ترجمہ و تحشیہ: جناب رحمٰن مذنب، شائع کردہ: فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور۔ قیمت ۹٫۵۰ روپے۔ صفحات: ۲۹۶۔

"مسلمانوں کے تہذیبی کارنامے" بنگال کے نامور مسلمان عالم اور محقق جناب مولوی نور احمد صاحب کی مشہور تصنیف GLORIES OF ISLAM کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں فاضل

مصنّف نے اسلام کے تہذیبی کردار کا بڑے علمی انداز میں جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ اس وقت جب اہلِ یورپ اندھیرے میں بھٹک رہے تھے، مسلمانوں نے علم کی قندیلیں روشن کیں۔ تہذیب کو چار چاند لگائے اور عقل کو اس کی صحیح حدود سے آشنا کر کے بامِ عروج تک پہنچایا۔ یورپ میں آج علم و ہنر کی جو روشنی ہے وہ سب ان صحرا نشینوں کی کوششوں کی رہینِ منت ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں مسلمانوں کے علمی اور فنی کارناموں، خصوصاً سائنس، فلسفہ، ادب، ریاضی، زراعت، باغبانی، تجارت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں اسلامی تعلیمات کے عملی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چنانچہ اس حصے میں اس طرح کے موضوعات زیرِ بحث آتے ہیں: اسلام اور مذہبی رواداری، حقوقِ انسانی اور اسلام، اسلام اور جمہوریت، اسلام اور بین الاقوامیت۔ تیسرے حصے میں احیاءِ اسلام کے امکانات اور اس کے روشن مستقبل کے بارے میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

فاضل مترجم جناب رحمان مذنب اردو کے معروف ادیب ہیں۔ انہوں نے اس علمی کتاب کو بڑے سلیقے کے ساتھ اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ انہوں نے اپنے اس فرض کی انجام دہی میں جس احساسِ ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے اس کا اندازہ اُن حواشی سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے مختلف مقامات کی وضاحت اور صراحت میں لکھے ہیں۔ معلوم نہیں مترجم اسلام اور مصوری اور اسلام اور موسیقی پر نوٹ لکھنا کیوں بھول گئے ہیں۔

معیارِ طباعت و کتابت عمدہ ہے۔ قیمت کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

شرح بالِ جبریل تالیف پروفیسر سید محمد عبدالرشید فاضل ایم۔ اے، صدر شعبۂ فارسی اردو کالج کراچی
ناشر: ادارۂ تنویراتِ علم و ادب، کراچی۔ صفحات ۴۴۸ قیمت سفید کاغذ مجلد: دس روپے۔ نیوز پرنٹ مجلد: سات روپے۔

زیرِ تبصرہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے علامہ اقبالؒ کے لازوال شعری مجموعے بالِ جبریل کی شرح ہے۔ کتاب کے آغاز میں فاضل مصنف نے کلامِ اقبال کے محاسن اور اس کے پیغام کے بارے میں ایک مختصر سا مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔

یوں تو علامہ اقبال کا ہر مجموعہ خیالات کی پاکیزگی اور رفعتِ تفکر کی گہرائی اور گیرائی زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت کی شہادت پیش کرتا ہے لیکن بالِ جبریل اس لحاظ سے ان سارے مجموعوں میں منفرد مقام کی حامل ہے کہ اس میں علامہ اقبال کی فکر کا نچوڑ آ گیا ہے اور اندازِ بیان بھی بعض دوسرے مجموعوں کی بہ نسبت سادہ ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اس مجموعے کو کالجوں کی تدریسی کتب میں بطور نصاب شامل کیا گیا ہے۔ اس بنا پر اس کی متعدد شرحیں بھی لکھی جا چکی ہیں جن میں مختلف نکتہ دانوں نے قارئین کے مخصوص حلقوں کو سامنے رکھتے ہوئے کلامِ اقبال کی تشریح کی ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب کو چونکہ فاضل مصنف نے طلبہ کے لیے مرتب کیا ہے اس لیے ان کی ذہنی استعداد اور مشکلات کا پوری طرح خیال رکھتے ہوئے اس "گنجِ معانی" کے اسرار و رموز سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اسی لیے اس شرح میں نہ تو غیر ضروری طوالت سے کام لیا گیا ہے اور نہ ایسے اختصار سے کہ اشعار کا محض لفظی ترجمہ ہو کر رہ جائے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب طلبہ کے لیے خاص طور پر مفید ہے۔ کتابت کی غلطیاں البتہ بہت زیادہ ہیں جنہیں آئندہ طباعت میں پوری کاوش سے درست کرنے کی ضرورت ہے۔ معیارِ طباعت و کتابت گوارا ہے۔

اسلامی لٹریچر کا داعی —— بامقصد کتب کا مرکز

ادارۂ مطبوعاتِ طلبہ

اسلام عصرِ حاضر میں	۸۰ ″	طلبہ اور پاکستان کی تعمیرِ نو	۳۰ پیسے
نظریۂ تعلیم اور اسلام	۲۵ پیسے	سواء السبیل	۱-۵۰ روپے
تعمیرِ سیرت کے لوازم	۳۵ ″	تحریکِ اسلامی کی کامیابی کی شرائط	۷۵ پیسے
مخلوط تعلیم	۱-۶۰ روپے	اسلامی نظام ہی کیوں؟	۴۰ ″
پاکستان کا مستقبل اور طلبہ	۳۵ پیسے	ہم اور ہمارا کام	۳۵ ″
ہمارا نظامِ تعلیم	۱۵ ″	میں نے جمعیت سے کیا پایا	۵۰ ″
ادب کی آڑ میں	۲-۰۰ روپے	دستورِ اسلامی جمعیۃ طلبہ	۶۰ ″

ادارۂ مطبوعاتِ طلبہ ۲/۴۰۶ نزد لسبیلہ مارکیٹ - کراچی

(بقیہ اشارات)

اور اس پیوندکاری سے اُسے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچتا۔ یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے جس میں بعض افراد اپنی سادگی سے مبتلا ہو جاتے ہیں اور بعض لوگ عیاری سے دوسروں کو گرفتار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دنیا کا ہر انقلاب انگیز نظریۂ حیات اپنے بطن سے ایک مخصوص ضابطۂ اخلاق کو جنم دیتا ہے۔ جس میں اس نظریہ کی رُوح پُوری طرح جاری و ساری رہتی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ کوئی انقلاب آفریں نظریۂ حیات دنیائے عمل میں سب سے پہلے ضابطۂ اخلاق ہی میں جلوہ گر ہوتا ہے تو یہ زیادہ صحیح ہے۔ اِس نقطۂ نظر سے جب ہم اسلامی نظریۂ حیات اور اس کے ضابطۂ اخلاق کے بارے میں غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح یہ نظریہ مقدس ہے اسی طرح اس کا ضابطۂ اخلاق بھی یکسر پاکیزہ ہے، اسی لیے اس کے بارے میں یہ سوچنا کہ اس میں فسق و فجور کی کوئی گنجائش نکالی جاسکتی ہے خدا اور اس کے رسول سے صریح بغاوت ہے۔ اب اگر ملت کے بعض "غم خوار" ملت کی دل جوئی کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ فسق و فجور کی زندگی سے ملت کو کوئی زیادہ نقصان نہیں پہنچ سکتا تو وہ پرلے درجے کے احمق ہیں کیونکہ کسی مسلم معاشرے میں منکرات کے فروغ پانے سے نہ صرف اس معاشرے کی اخلاقی صحت برباد ہوتی ہے بلکہ اس سے اسلامی نظریۂ حیات، جو مسلم قوم کی طاقت کا واحد سرچشمہ ہے سے بھی تعلق منقطع ہوتا ہے۔ اس لیے مسلم قوم جب فسق و فجور کی زندگی اختیار کرتی ہے تو وہ خود اپنی بربادی کو دعوت دیتی ہے۔

مغربی اقوام کا حال ہم سے مختلف ہے۔ ان کے ہاں بھی اگرچہ شراب و شاہد کا رسیا ہونا کوئی پسندیدہ کام نہیں سمجھا جاتا بلکہ بُرائی ہی تصور کیا جاتا ہے، مگر ان کی آئیڈیالوجی کے ساتھ انہیں جو ضابطۂ حیات دیا گیا ہے وہ اس فسق و فجور سے تہس نہس نہیں ہو جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان برائیوں کے وجود سے اُن کی اخلاقی حالت کافی بگڑتی تو ہے مگر ان کی اجتماعی زندگی یکسر تہ و بالا نہیں ہو جاتی لیکن ہماری اخلاقی بے راہ روی سے وہ ساری اقدار تباہ ہو جاتی ہیں جن کے علمبردار ہونے کے ہم دعویدار ہیں اور جن کی وجہ سے ہم دنیا میں ایک الگ ملت شمار کیے جاتے ہیں۔

دشمن کے تیسرے نفسیاتی ہتھکنڈے یعنی قوم کے اندر غیر سنجیدہ طرزِ فکر اور غیر سنجیدہ طرزِ عمل پیدا کرنے کی مذموم کوششوں کو بھی ہمیں پوری طرح ناکام بنانے کی فکر کرنی چاہیے۔ اس معاملے میں عوام اور قائدین دونوں پر بڑی بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ عوام کو قائدین کے اقوال و اعمال پر برابر نگاہ رکھنی چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ وہ جس قسم کی خوش کن باتیں کر رہے ہیں کیا وہ ان میں سنجیدہ اور مخلص ہیں یا محض لوگوں کے دل بہلانے کے لیے مختلف اوقات میں ان کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اور اگر عوام یہ محسوس کریں کہ ان کے رہنما ان کے جذبات سے کھیل رہے ہیں، اور غلط توقعات کے محل کھڑے کر کے انہیں وقتی طور پر خوش کرنے میں مصروف ہیں تو انہیں ایسے قائدین کا احتساب کرنا چاہیے۔ کیونکہ محض خوش کن باتیں کرنے یا الفاظ کے استعمال میں مطلق العنان ہونے سے کسی قوم کی بگڑی نہیں بنتی۔ اس کے لیے سنجیدہ طرزِ فکر، ٹھوس طرزِ عمل اور تدبر، خلوص اور دانائی کا وافر سرمایہ درکار ہوتا ہے۔

دوسری طرف قائدین کو بھی قوم کے بارے میں ہمیشہ یہ فکر دامنگیر رہنی چاہیے کہ قوم تعمیر و ترقی کے صبر آزما کام سے منہ موڑ کر کہیں محض کھوکھلے نعروں پر زندگی بسر کرنے کی خوگر تو نہیں ہوتی جا رہی اور محنت سے جی چرا کر صرف خواہشات اور تمناؤں کے پیچھے چلنے کو ہی اپنی زندگی کا مقصود نہیں سمجھ بیٹھی۔ عوام کی دلجوئی، عوامی مسائل سے دلچسپی ہر مخلص رہنما کا فرض ہے جس کو اسے پورے خلوص سے سر انجام دینا چاہیے لیکن یہ قوم کی خیر خواہی نہیں بلکہ اس کی بدخواہی ہے کہ قائدین قوم کی کمزوریوں کی اصلاح کرنے کے بجائے ان سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیں اور قوم جس غلط راہ پر گامزن ہے اس سے اسے ہٹانے اور صحیح راہ پر چلانے کے بجائے وہ نہ صرف اسے غلط راہ پر بلا روک ٹوک چلنے دیں بلکہ "تیز ترک گامزن منزلِ ما دور نیست" کا نعرۂ مستانہ لگا کر اسے برق رفتاری کے ساتھ بربادی کی اس راہ پر آگے بڑھنے کی ترغیب دیں۔ اس روش کی کسی مخلص رہنما سے کسی طور بھی توقع نہیں کی جا سکتی۔ عام زندگی میں ان افراد کو انسانیت کا دشمن گردانا جاتا ہے جو انسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اپنے لیے دنیوی فوائد حاصل کرتے ہیں تو ان قائدین سے اس انسانیت سوز طرزِ عمل کی کس طرح توقع کی جا سکتی ہے جو قوم کی سربلندی کے لیے اپنی جان تک قربان کرنے کے دعویدار ہوں۔

زندگی کے مختلف پہلوؤں پر

۲۰ مختصر کُتب کا جامع سیٹ (ع۲)

کتاب	پیسے	روپے
۱- اسلام اور جاہلیت	۵۰	۰۰
۲- سرورِ عالم	۷۰	۰۰
۳- اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	۵۰	۰۰
۴- اسلام کی معاشی اسکیم	۲۵	۰۰
۵- ہمارے داخلی وخارجی مسائل	۱۰	۱
۶- فریب خوردہ شاہین کے نام	۱۵	۰۰
۷- سیاست ایک دینی تقاضا	۰۰	۱
۸- اسلام کی اقتصادی پالیسی	۷۰	۰۰
۹- کمیونزم یا اسلام	۲۵	۰۰
۱۰- انسان کا معاشی مسئلہ اور اُسکا اسلامی حل	۵۰	۰۰
۱۱- اسلام اور عدلِ اجتماعی	۴۰	۰۰
۱۲- بناؤ اور بگاڑ	۸۰	۰۰
۱۳- اسلامی ریاست میں ذمیوں کے حقوق	۵۰	۰۰
۱۴- پاکستان کے انتخابی نتائج اور جماعتِ اسلامی کی پوزیشن	۲۵	۰۰
۱۵- اسلام، سوشلزم اور اسلامی سوشلزم	۳۱	۰۰
۱۶- مولانا مودودی پر اعتراضات کی حقیقت	۰۰	۱
۱۷- سوشلزم اور تشدد۔	۱۵	۰۰
۱۸- فرعون وکلیم کی داستانِ کشمکش	۴۰	۰۰
۱۹- دین یا لادینیت	۲۵	۱
۲۰- تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں	۰۰	۱

پُورا سیٹ خریدنے پر خوبصورت پاکٹ ڈائری مع پلاسٹک کور پرس مفت۔ ڈاک خرچ فری۔

(چونکہ ڈائری محدود تعداد میں ہے اس لیے فوراً فرمائش بھیجیے تاکہ آپ اس خصوصی رعایت سے محروم نہ رہ جائیں)

پورا سیٹ صرف -/۱۱ روپے ہیں

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۳-اے، شاہ عالم مارکیٹ لاہور (فون-۶۸۳۴۱)